مطبوعاتِ مجلسِ یادگارِ غالب
پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۱۳

غالب
ذاتی تاثرات کے آئینے میں

غالبؔ

ذاتی تاثرات کے آئینے میں

مجلسِ یادگارِ غالب

★

صدرِ مجلس:

پروفیسر حمید احمد خان ستارۂ پاکستان / ستارۂ امتیاز وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور

ارکان

جناب عبد الرحمن چغتائی لاہور

مولانا غلام رسول مہر لاہور

پروفیسر ڈاکٹر سعید اللہ سابق صدر شعبۂ فلسفہ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور

سیّد امتیاز علی تاج، سیکرٹری مجلسِ ترقی ادب لاہور

مولانا حامد علی خان، مدیر مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن لاہور

کیپٹن عبد الواحد مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن لاہور

ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمن، سابق چیف جسٹس پاکستان لاہور

پروفیسر ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد صدر شعبۂ امورِ طلبا پنجاب یونیورسٹی لاہور

گروپ کیپٹن سیّد فیاض محمود ناظم شعبۂ تاریخِ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

پروفیسر ڈاکٹر سیّد عبد اللہ صدر دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ناظم ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج و صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور

سید وقار عظیم، غالب پروفیسر اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

سید وزیر الحسن عابدی، ریڈر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور

جناب احمد ندیم قاسمی، مدیر مجلۂ فنون لاہور

پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی، صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

جناب صفدر میر، روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل، صدر شعبۂ نفسیات گورنمنٹ کالج لاہور

پروفیسر اختر اقبال کمالی، شعبۂ انگریزی اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور

ڈاکٹر وحید قریشی، ریڈر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

جناب انتظار حسین روزنامہ مشرق لاہور

جناب اقبال حسین، شعبۂ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

معتمد

ڈاکٹر آفتاب احمد خان، جائنٹ سیکرٹری وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان ڈھاکہ

ڈاکٹر عبد الشکور احسن، ریڈر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور

نائب معتمد

سید سجاد باقر رضوی، لیکچرر انگریزی، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

پیش لفظ

مجلسِ یادگارِ غالب کا قیام پنجاب یونیورسٹی کے ایک فیصلے کے مُطابق عمل میں آیا اور پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اس کے صدر مُقرر ہُوئے۔ مجلس نے غالِب کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے جو کتابیں شائع کرنے کا منصُوبہ بنایا تھا اُنھیں مَیں غالِب شناسوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہُوں۔

یُونیورسٹی کے ایک اَور فیصلے کی رُو سے شعبۂ اردو میں کُرسیِٔ غالِب قائم ہُوئی۔ مَیں مسرّت کے ساتھ اِعلان کر رہا ہُوں کہ اِس اسامی پر پروفیسر سیّد وقار عظیم کا تقرر کیا جا چُکا ہے۔

(پروفیسر) علاءُ الدّین صِدّیقی

وائس چانسلر، جامعۂ پنجاب

لاہور

سینیٹ ہال

مارچ ۱۹۶۹ء

تعارف

★

فروری ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی وفات پر ایک سو برس پورے ہو رہے ہیں۔ اس موقع کی مناسبت سے پنجاب یونیورسٹی نے شاعر کی عظمت کے اعتراف کے طور پر نہ صرف شعبۂ اردو میں ایک پروفیسر کی نئی اسامی "(کرسیٔ غالب)" قائم کی ہے، بلکہ مجلسِ یادگارِ غالب کے تعاون سے ایک سلسلۂ مطبوعات شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مجلسِ یادگارِ غالب کے قیام کی تحریک جنوری ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے کی۔ وہ مجلس کے پہلے معتمد اور سید سجّاد باقر رضوی شریک معتمد مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے لاہور سے ڈھاکے منتقل ہو جانے پر ڈاکٹر عبدالشکور احسن مجلس کے دوسرے معتمد قرار پائے۔

اواخر ۱۹۶۸ء میں جب ہمارا سلسلۂ کتب طباعت کے مرحلے میں داخل ہوا تو صدرِ مجلس کو ڈاکٹر محمد باقر کی مسلسل اعانت اور مشورہ بھی قدم قدم پر میسّر رہا۔ جن اربابِ فکر و نظر نے مجلس کی درخواست پر اس سلسلۂ کتب کی ترتیب تالیف یا تصنیف میں حصّہ لیا اُن میں سے ہر ایک کا نام متعلقہ کتاب کے سرورق

کی زینت ہے۔ مجلسِ یادگارِ غالب کے ارکان کے ناموں کی پوری فہرست اِس کتاب کے شروع میں الگ شائع کی جا رہی ہے۔

مجلس کے سلسلۂ مطبوعات میں سب سے پہلے مرزا غالب کی تصانیف آتی ہیں جو اُردو اور فارسی نظم و نثر پر مشتمل ہیں۔ یہ تصانیف نفسِ مضمون کی رعایت سے یا موزونی ضخامت کا لحاظ کر کے مختلف جلدوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ اِن سب کتابوں پر مؤلفین نے دیباچے لکھے ہیں اور حسبِ ضرورت حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ نیز جہاں تک ممکن ہو سکا دستیاب وسائل کی مدد سے ہر متن کی تصحیح کی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غالب کی تصانیف میں سے کوئی کتاب رہ نہ جائے۔ چنانچہ اُن کی بعض نگارشات جو مرورِ زمانہ سے تقریباً ناپید ہو چکی تھیں، اب پھر اہلِ نظر کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہیں۔ دیوانِ غالب کا نسخہ حمیدیہ، جسے صدرِ مجلس نے مرتّب کیا ہے، ایک پہلے فیصلے کے مطابق مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ غالب کی صرف یہی ایک کتاب مجلسِ یادگارِ غالب کی مطبوعات میں شامل نہیں۔

مرزا غالب کی تصانیف کے علاوہ مجلس کی مطبوعات میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن میں اِس یگانۂ روزگار کے شخصی، فنّی اور فکری کمال کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو انگریزی دان لوگ اُردو نہیں جانتے انہیں

غالب کے فکر و فن سے متعارف کرنے کے لئے ایک مفصّل کتاب انگریزی زبان میں شائع کی جا رہی ہے۔ ایک اور کتاب میں غالب پر شائع شدہ مواد کے متعلّق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ پھر اس سوال کا جواب کہ "میں نے غالب سے کیا پایا" ایک تیسری کتاب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس میں متعدّد غالب شناس حضرات کے ذاتی تاثّرات جمع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مجموعے میں گذشتہ ایک سو برس کی تنقیدِ غالب کا خاکہ اقتباسات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتابیں فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہو رہی ہیں۔ گویا ان کی تاریخِ اشاعت سے مرزا غالب کی حیات بعدِ ممات کی دوسری صدی شروع ہوتی ہے۔ مجلس کو یقین ہے کہ اس دوسری صدی میں غالب کے قبولِ عام کی سرحدیں کچھ اور وسیع ہو جائیں گی۔ خدا کرے کہ دنیا کو ہند اسلامی تمدن کے آخری ترجمان سے روشناس کرانے میں مجلس کی یہ سعی رائگاں نہ جائے۔

حمید احمد خاں
صدر مجلس یادگار غالب
جامعۂ پنجاب، لاہور

سینیٹ ہال
فروری ۱۹۶۹ء

فہرست

o

دیباچہ

غالب کی زندگی اور کلام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا جاتا رہا ہے ، لیکن شاعری محض معاشرتی و تاریخی ضرورت نہیں ہوتی ، ذاتی اور انفرادی ضرورت بھی ہوتی ہے ۔ قاری کا شاعر کے ساتھ ایک ایسا انفرادی تعلق بھی ہوتا ہے جس کا تنقیدی اظہار (خواہ وہ تاثراتی تنقید کی ذیل میں کیوں نہ ہو) ممکن ہی نہیں ہوتا ۔ اس بات کے پیش نظر "مجلس یادگارِ غالب" نے یہ طے کیا کہ غالب سے متعلق اس دور کے اہل قلم اور اہلِ ذوق حضرات کے ذاتی تاثرات پر مشتمل مختصر مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جائے ۔ یہ کتاب ایسے ہی مختصر مضامین کا حاصل ہے جن میں مختلف اہلِ قلم اور اہلِ ذوق اصحاب نے غالب سے اپنی انفرادی و ذاتی وابستگی کا اظہار کیا ہے ۔

کسی شاعر کی عظمت کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ آپ کی عمر کی کن منزلوں تک آپ کا ساتھ دے سکتا ہے ۔ اسی تناسب سے آپ کی ذات کے لیے شاعر اہم یا غیر اہم ہو سکتا ہے ۔ غالب کے متعلق اس کتاب میں شامل مضامین کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ کس طرح یہ عظیم شاعر مختلف اہلِ قلم حضرات کو ایک عمر متاثر کرتا رہا ہے ۔ یوں تو ذوق کے قوانین اخلاقی قوانین کی طرح ہمہ گیر نہیں ہوتے تاہم ذوق کی تربیت میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ عمر کے مختلف حصوں

میں مختلف شعرا قاری کے دل و دماغ کو مسخر کرتے رہتے ہیں۔ بالغ ذوق کے معنی یہ ہیں کہ ایک عمر کے مطالعے اور تجربے کے بعد آپ شعرا کی درجہ بندی کر لیتے ہیں ، کچھ کو معیار کے اعتبار سے زیادہ بڑا درجہ دیتے ہیں اور کچھ کو نسبتاً کم تر سطح پر رکھتے ہیں۔ غالب کے متعلق اس کتاب کے مختصر مضامین میں درج شدہ تاثرات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ با ذوق قارئین کا تمام عمر کا ساتھی ہے۔ للہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کم از کم غالب کی تحسین کے متعلق ذوق کا قانون ، اخلاقی قانون کی طرح ہمہ گیر ہے۔

غالب بچپن کا ساتھی ، جوانی کا دوست اور بڑھاپے کا ہم‌نوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذوق کی تربیت کے کسی مرحلے پر بھی غالب سے قطع نظر ناممکن ہے۔ بزم سرود ہو یا محفل سماع ، خلوت ہو یا جلوت ، اعلیٰ غور و فکر کی ہموار سطح ہو یا جذبہ و احساس کی جولانی ، غالب بہ ہر عنوان غالب ہے۔ غالب برصغیر میں مسلمانوں کے تقریباً ہزار سالہ تمدن کے طرز احساس کی تخلیق ہے۔ اس تخلیق کے پیچھے وہی محرکات و عوامل کارفرما ہیں جنھوں نے تاج محل ، لال قلعہ ، شاہی مسجد اور شالیمار باغ کی تخلیق کی۔ غالب نے اپنے کلام میں دم توڑتے ہوئے عظیم تمدن کی تہذیب اور اس کے طرز احساس کو سمیٹ لیا ، تاہم غالب جدید طرز احساس کی ابتدا بھی ہے۔ یوں اس کے ذریعے ماضی کے احساس کی تاریخ حال سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔ وہ انسانی امکانات اور انسانی قوتوں کا شاعر ہے اور اسی لیے روشن مستقبل کی جانب بھی نگاہ رکھتا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ماضی ، حال اور

مستقبل تینوں زمانوں پر محیط ہے اور یہ بھی کہ غالب زمان و مکاں کے قیود سے ماورا ایک ہمہ سطحی و ہمہ جہتی استعارہ ہے - یہی سبب ہے کہ آج سو برس بعد ہم غالب کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں اور اس کتاب میں شامل مضامین جو پختہ ذوق اور بالغ نظر اصحاب کے تاثرات کا نتیجہ ہیں ، غالب کو عمر کی ہر منزل پر رفیق و ہم‌نوا ثابت کرتے ہیں -

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج
لاہور

سجاد باقر رضوی

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندّی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے

گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ۔۔۔ ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں! ۔۔۔ آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!

گیسوئے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے

شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر ۔۔۔ ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر ۔۔۔ یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟

تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

ویمر — جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں

اگر آپ یہ دریافت کریں کہ غالب کے نظامِ جذبہ و فکر سے مجھے کیا حاصل ہوا، تو میرے لیے اس سوال کا سیدھا سادھا مختصر جواب دینا دشوار ہوگا۔ اس دشواری کا ایک سبب تو یہ ہے کہ غالب کے ساتھ میرے دل و دماغ کا معاملہ نصف صدی سے بھی پرانا ہے اور پچاس برس کے معاملات دو چار لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتے۔ پھر غالب کا تخیل انسانی فطرت کے اتنے بے شمار پہلوؤں کو محیط ہے کہ صرف اپنے ڈھب کے کوائف کا ذکر بھی کیجیے تو اس کے لیے مہلت درکار ہے۔ میرے نزدیک غالب کا یہ کمال حیرت انگیز ہے کہ گو میری زندگی نے کئی پلٹے کھائے مگر عمر کے کسی مرحلے میں بھی غالب نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

لڑکپن کے زمانے میں جب میں ابھی مدرسے میں پڑھتا تھا غالب کے شامل نصاب، نام نہاد آسان اشعار میرے لیے باعث دل چسپی نہ تھے۔ کم از کم مجھے اب یاد نہیں ہے کہ ''پھر اس انداز سے بہار آئی'' وغیرہ اشعار سے میں کس قسم کا لطف اٹھاتا تھا۔ ہاں جو شعر سمجھ میں نہ آتے تھے ان کا کیف و سرور

اب تک ذہن میں محفوظ ہے ۔ مثال کے طور پر یہ شعر لیجیے ـــــ

غنچہ تاشگفتنہا برگ عافیت معلوم!
باوجود دل جمعی خواب گل پریشان ہے

میں لڑکپن کے دنوں میں اس شعر کے معنی مطلق نہ سمجھتا تھا مگر اس کے لفظوں کا طلسم اور اس کی آواز کا نغمہ مجھے بہت متاثر کرتا تھا ۔ اب بھی وہ نوعمر طفل مکتب جو غالب کے سمجھ میں نہ آنے والے اشعار کے خالص صوتی آہنگ اور خوب صورت لفظی ترکیبوں کے اشارات و کنایات پر جھوم اٹھتا تھا ، میری روح کی گہرائیوں میں زندہ سلامت موجود اور نہ صرف موجود ہے بلکہ شکر گزار ہے کہ غالب کی موسیقی کے ساتھ اس کے ان اولین تجربات نے ایسے اردو اور فارسی نظم کے لاتعداد معنوی محاسن سے آشنا کیا ۔ اب غالب کے منطقی مفہوم کی سرحدوں میں داخل ہونے کے بعد بھی مجھے غالب کی لازوال موسیقی کی گونج غالب کے اشعار میں اپنی وہی پہلی تازگی لیے ہوئے سنائی دیتی ہے :

ہے موج زن اک قلزم خوں ، کاش یہی ہو !

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا !

آن راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بردار توان گفت و بہ ممبر نتوان گفت

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

اوائلِ سن شعور میں غالب کے کلام کے جس پہلو نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ مادی کائنات کی وسعتوں پر غالب کے ذہن کی گرفت تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدید طبیعیات کے افکار نوجوانوں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ ہماری کائنات کچھ ایسی نامحدود بھی نہیں ہے ۔ یہ آسمان و زمین اور یہ تمام سورج چاند ، ستارے ، باوجود اپنی ظاہری عظمت کے ، پوری کائنات کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے ۔ اس قسم کا کائناتی احساس غالب کے ابتدائی اشعار میں بھی بدرجۂ کمال ملتا ہے :

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم ، یارب ؟

سہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزار باد یاں

نہ پوچھ وسعت میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

غور کیجیے تو اس قسم کے مصرعے جیسے "بنیں گے اور

ستارے اب آسمان کے لیے" غالب کے شعور کی اسی عظیم کائناتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں ۔

عالم طبیعی کے اس مجموعی تصور کے علاوہ دیوان غالب میں مظاہر فطرت کا پر لطف مشاہدہ بھی اس دور میں میرے لیے بہت باعث کشش ہوا ۔ اس انداز نظر میں اس قبیل کے اشعار شامل ہیں جیسے :

"بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا"

"برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی"

اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

یا

"سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند"

اسی زمانے میں میرے لیے غالب کے مطالعۂ فطرت انسانی کے ساتھ غالب کے مشاہدۂ فطرت کا لطف بھی شامل ہو گیا ۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے اور اس کا کیف و سرور میرے دل میں ہمیشہ تازہ رہا ہے :

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

———

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

———

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

———

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے!

فطرت انسانی کی ان جھلکیوں کو غالب بارہا ایک فلسفیانہ رنگ دے دیتا ہے۔ مثلاً

در دل سنگ بنگرد رقص بتان آذری

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا!

اور پھر عقل سلیم کو جو سہارا ان فیصلوں سے ملتا ہے وہ سلاست طبع کا ایک خاص رنگ پیدا کرنے میں باعث مدد ہوتا ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

غالب کے اس قسم کے اشعار میں بارہا ایک ایسی وسعت مشرب کی تلقین ملتی ہے جسے غالب کے ضابطۂ اخلاق کا رکن اعظم قرار دینا چاہیے۔

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارہ می خواہم
کہ بامن قصہٴ بت خانہ ہائے ہند و چین گوید

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبعت ادھر نہیں آتی

غم کے جو اشعار غالب میں ملتے ہیں ان سے مجھے خاص موقعوں پر دلی تسکین حاصل ہوئی ہے :

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں

پیکاریٴ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بعض قارئین نے احساس غم کی اس بے مثال لطافت کو غالب کا مبتداو منتہا قرار دیا ہے - لیکن یہ رائے درست نہیں ہے - غالب نہ صرف آتش غم کے سوز و گداز سے واقف ہے بلکہ اس آگ کی بھٹی سے سچی انسانی عظمت کا کندن بھی نکال لاتا ہے :

بے غم نہاد مرد گرامی نمی شود
زنہار قدرِ خاطر اندوہ گین شناس

خون جگر بجائے مے مستیٔ ما قدح نداشت
نالۂ دل نوائے نے رامشِ ما ، غچک نخواست

مژدهٔ صبح درین تیره شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

نہیں بہار کو فرصت ، نہ ہو ، بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

زندگی کی تلخیوں سے اس طرح عبرت اندوز ہونے کے بعد غالب اپنے قاری کو اس مقام پر بھی لے جاتا ہے جہاں سکون روح اور طمانیت قلب ایک مستقل کیفیت رکھتے ہیں :

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

تاجر شوق بدان ره بہ تجارت نرود
کہ رہ انجامد و سرمایہ بغارت نرود

اس مقام پر پہنچ کر غالب کا آخری مشورہ یہ معلوم ہوتا ہے :

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

مولانا غلام رسول مہر

در عرض غمت پیکر اندیشہ لالم
پاتا سرم اندازِ بیان است و بیاں نیست

میں مشن ہائی سکول جالندھر کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا ، جب شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا - (۱۹۰۹ع) ضامن علی ضامن کا دیوان کہیں سے ہاتھ آ گیا تھا ، اس کی غزلوں پر طبع آزمائی کر کے شوق کی پیاس بجھاتا - یقین ہے کہ جو کچھ کہتا تھا ، وہ قابلِ توجہ تو کیا ، غالباً صحیح بھی نہ ہوگا - تاہم خوب یاد ہے کہ اپنی ہر غزل کئی مرتبہ صاف کاغذوں پر لکھ لکھ کر خوش ہوتا تھا - گویا ''طفلِ خود نما'' کا سا معاملہ تھا :

یک حرف خواندہ ایم و بصد جا نوشتہ ایم

کچھ عرصے کے بعد خیال آیا کہ اس ''تک بندی'' کے متعلق کسی سے مشورہ ضرور کر لینا چاہیے - ایک ہم جماعت سے بات کی تو اس نے مولانا حکیم محمد سلیم کی بارگاہ میں حاضری کی صلاح دی ، جو بستی غذاں میں رہتے تھے اور بستی غذاں،

مشن ہائی سکول سے زیادہ دور نہ تھی -

مولانا سلیم عربی ، فارسی اور اردو کے تو فاضل تھے ہی، بھاشا بھی خوب جانتے تھے اور چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے - میں نے انھیں تفسیر ، حدیث ، فقہ ، تاریخ وغیرہ مختلف علوم پر بے تکلف فاضلانہ گفتگو کرتے ہوئے بارہا سنا ، ہیئت و جفر میں بھی انھیں دست گاہ حاصل تھی - فن خطاطی میں بھی ماہر تھے - ایک روز میری نظر اچانک ان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر پڑی تو معلوم ہوا ناخن بہت بڑھا ہوا ہے - میں نے سمجھا اتفاق سے ناخن ترشوانا بھول گئے - ان سے ذکر کیا تو چپ چاپ سفید کاغذ کا ایک تختہ اٹھایا جو سامنے پڑا تھا اور چند لمحوں میں اس پر ابجد کے نہایت خوبصورت نقوش ناخن سے بنا دیے - طب کو تو انھوں نے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا تھا اور مشہور تھا کہ تشخیص و تجویز میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے -

میں ان کی خدمت میں پہنچا تو عمر ستر کے قریب معلوم ہوتی تھی - بال بالکل سفید ہو چکے تھے - اگرچہ صحت اچھی تھی ، تاہم اٹھنے بیٹھنے میں خاصا تکلف محسوس کرتے تھے - علم و فضل کے باوصف ان کی آمدنی بہ‌ظاہر بہت محدود تھی - مریض بھی کم ہی آتے تھے - حقیقت یہ ہے کہ اوائل شباب ہی میں وہ عرق نوشی کے عادی ہوگئے تھے - اس شغل میں

انہاک کے باعث ان کے تمام کمالات پر پردہ سا پڑ گیا اور وہی صورت پیدا ہو گئی ، جس کا نقشہ میرزا غالب نے اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے یوں کھینچا ہے :

جوہرِ طبعم درخشان است ، لیک
روزم اندر ابر پنہاں می رود

مولانا سلیم مرحوم خود بھی بعض اوقات عالم سرور میں نہایت عمدہ علمی گفتگو کرتے ہوئے یکایک پیکر حسرت بن جاتے اور میرزا غالب کا یہ شعر پڑھتے :

یہ مسائلِ تصوف ، یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے ،جو نہ بادہ خوار ہوتا

ساتھ ہی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں ، لیکن میری اور بعض دوسرے نیاز مندوں کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ عرق نوشی ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ۔ ان حالات میں خوش گوار تغیر کی کیا اُمید ہو سکتی تھی ؟

مولانا کے حالات بےحد دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی ، تاہم میں یہ داستان چھیڑ دوں تو اصل موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا ۔

یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا نے مجھے شرفِ تلمذ سے بھی نوازا ۔ میرا موجودہ تخلص بھی انھیں کا عطیہ ہے ، اگرچہ اس کی حیثیت مدت سے ایک تہمت کی سی رہ گئی ہے ،

سب سے بڑھ کر یہ کہ چند ہی روز کے بعد ''دیوان غالب'' پڑھنے کی تاکید فرمائی ، بلکہ چند غزلیں خود پڑھائیں، افسوس کہ میں کم علمی کے باعث ان کی تشریحات سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا - پھر مولانا حسرت موہانی اور شوکت میرٹھی کی شرحیں پڑھیں ، وہ بھی میرے لیے چنداں سود مند ثابت نہ ہوئیں - لیکن شفیق استاد کے تاکیدی ارشاد کی تعمیل میں ''دیوان غالب'' کا مطالعہ برابر جاری رکھا - اگرچہ سوچتا ہوں تو آج بھی مجھ پر قطعاً واضح نہیں ہوتا کہ اس ارشاد کی بنیاد کیا تھی - رفتہ رفتہ طبیعت کو میرزا کے اسلوب بیان سے اک گونہ مناسبت پیدا ہونے لگی اور زیادہ تر اشعار کے معانی فہم کی دسترس میں آنے لگے -

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں پہنچا تو میرزا کے فارسی کلام سے روشناس ہوا - پھر بیدل کا مطالعہ شروع کر دیا ، صرف اس خیال سے کہ میرزا غالب نے ابتدا میں بیدل بہت پڑھا تھا - لیکن یہ دور جلد ختم ہو گیا :

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم ، نقشِ پاے رہرواں نامیدمش

میرزا ہی کی رہنمائی میں فارسی کے مشہور اساتذہ تک رسائی نصیب ہوئی ، جن میں سے بعض کا کلام عموماً میری زبان پر

جاری رہتا ہے۔

میرزا غالب کے ساتھ اولین روشناسی پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے، تاہم آج بھی دل میں یہی آرزو موجزن رہتی ہے کہ گونا گوں مشاغل سے کچھ مہلت میسر آ جائے تو اسے میرزا کے فارسی اور اردو کلام یا اردو مکاتیب کے مطالعے میں گزار دوں، شاید اس طرح معنی رسی اور حقائق شناسی کی صلاحیت میں کسی قدر جلا پیدا ہو جائے۔

الحمد للہ کہ میں اپنی فطری یا اکتسابی استعداد کے بارے میں غلط فہمی سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ قدرت نے جو کچھ عطا کیا تھا، اس کی حیثیت قرآن حکیم کے لفظوں میں ''بضاعتہ مزجاۃ'' کی سی ہو گی۔ باقی رہا تحصیل و اکتساب کا معاملہ تو میں ہر دور میں نارسائیوں، نامساعدتوں اور واماندگیوں کا شکوہ سنج رہا۔ تاہم میرے کشکولِ فکر و نظر میں جو بھی حقیر سی پونجی موجود ہے، اس میں شعر و ادب کی حد تک ہر شے کو میں اصلاً میرزا غالب ہی کا فیضان سمجھتا ہوں، میرے ذوق، میری صلاحیت فہم حقائق، میری قوت اخذ معارف، میرے معیار ''خوب'' و ''نا خوب'' نے میرزا ہی کے کلام کی آغوش ممارست میں تربیت پائی۔ غرض میں جو کچھ بھی بن سکا، اس کی بنیادیں میرزا ہی کی بارگاہ عظمت میں پر خلوصِ عقیدت کی بدولت استوار ہوئیں۔ اس کے لیے

اپنے شفیق و مکرم استاد مولانا حکیم محمد سلیم کے لیے نوافل سحر گاہی میں بالالتزام دعا کرتا ہوں۔

میرزا کا یہ شعر بے شمار اصحاب نے پڑھا ہوگا، بلکہ اسے جا بجا استعمال بھی کیا ہوگا:

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

میں فرومایگی کے دلی اعتراف کے ساتھ اپنے تصور کے مطابق اپنے آپ کو اس کی صداقت کی ایک شہادت سمجھتا ہوں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خدا نخواستہ میں اپنے عیار طبع کے متعلق حسن ظن میں مبتلا ہوں یا میرزا غالب واقعی متاعِ سخن کے ساتھ بہ نفس نفیس میرے پاس آ گئے، حاشا و کلا۔ صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے جو کچھ ملا، میرزا ہی کے سرچشمۂ فیض سے ملا۔ اگر آپ کی نظر میری بےحقیقتی اور بے مایگی کی طرف جائے تو خواجہ شیراز کی حقیقت گوئی نظر انداز نہ ہونی چاہیے:

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالاے کس کوتاہ نیست

اس سلسلے میں ایک بدیہی نقصان کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ بالکل ابتدائی دور میں میرزا کے کلام سے شغف پیدا ہو جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ میں اقبال کے سوا کسی

بھی اردو شاعر کا کلام آج تک بالاستیعاب نہ پڑھ سکا۔ مختلف شعرا کے دواوین صرف جستہ جستہ ہی دیکھ سکا۔ کیونکہ اقبال کو مستثنٰی کرتے ہوئے غالب کی آتش سیال کا سا کیف و سرور کسی دوسرے خُم خانے میں نہ مل سکا۔

اگرچہ یہ ذکر پیش نظر موضوع سے بے تعلق ہے، تاہم میرے لیے ایسی ہی صورت اردو نثر میں بھی پیش آئی۔ میں نے بالکل ابتدائی دور میں ''الہلال'' پڑھا اور شعر سے نثر کی طرف توجہ ''الہلال'' ہی کے باعث منعطف ہوئی۔ مولانا ابوالکلام مرحوم کے اندازِ بیان نے ذہن و دماغ پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ میں اردو نثر کے بھی بیشتر عمدہ ذخیروں سے جزواً ہی مستفید ہو سکا۔

میری مثال کوئی اچھی اور قابلِ تقلید مثال تو یقیناً نہیں، مگر یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر ذوق صحیح کے نشو و ارتقا کی آرزو ہو، اگر حقائق و معارف عالیہ سے حقیقتہً لذت یاب ہونے یا انھیں دل پذیر طریق پر پیش کرنے کی صلاحیتوں میں فروغ و بالیدگی کی جستجو ہو تو میرزا کا کلام ضرور پڑھیے، نظم بھی اور نثر بھی۔ اس طرح پڑھیے جو پڑھنے کا حق ہے۔ اس عاجزانہ گزارش کو شرف قبولِ بخش کر آپ یقیناً پشیمان نہ ہوں گے۔ میرزا کا یہ ارشاد شاعرانہ تعلّی کا

کرشمہ نہیں ، حقیقت کا ترجمان ہے :

در تہِ ہر حرف غالب ، چیدہ ام میخانۂ
تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

میاں بشیر احمد

اہلِ ذوق کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ غالب کو "ذاتی تاثرات کے آئینے" میں دیکھیں اور بتائیں کہ انھیں وہاں کیا نظر آتا اور کیا کچھ محسوس ہوتا ہے؟ یہ بات جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار بھی ہے - اپنے وارداتِ قلب کا بیان کسی وقت تو بلا دقت سامنے آجاتا ہے لیکن کسی وقت اپنے قلب کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے جب کہیں جا کر یہ چھپا ہوا موتی برآمد ہوتا ہے -

اردو ادب پر غالب کا اتنا رعب اور اثر ہے کہ نقاد و غیر نقاد دونوں طرح کے اصحاب اس کی غزلیں سننے سنانے میں جا بجا واہ وا اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور بھی ہوتے ہیں اور ان سے لطف بھی اٹھاتے ہیں - یہ تنقید نہیں تحسین ہے یہ دل کا تحفہ ہے دماغ کے لیے! اسی بنا پر غالب کی بابت اقبال نے خوب کہا ہے:

"زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا"!

غالب کی "مشکلیں" اور "آسانیاں" اس کے سارے دیوان

میں بکھری پڑی ہیں - ''مشکلوں'' کی بابت تو خود غالب نے کہہ دیا ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' - اور ''آسانیوں'' کی یہ کیفیت ہے کہ جیسی آسان و رواں غالب کی بعض غزلیں ہیں شاید کسی اور بڑے شاعر کی نہیں - اس وقت غالب کی بیسیوں دل پذیر غزلیں سامنے آرہی ہیں، بیسیوں اشعار زبان پر آرہے ہیں - اگر گنجائش ہوتی تو یہاں اُن سب کو پیش کر دیا جاتا اور ہزارویں بار اُن سے لطف اُٹھایا جاتا لیکن یہاں اس انتخاب کا موقع و محل نہیں - پھر بھی کچھ سن لیجیے گو جو کچھ آپ خوب جانتے ہیں میں وہی دہرانے لگا ہوں :

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے ؟

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ایک زمانے میں مجھے غالب پر یہ اعتراض تھا کہ وہ بادہ خوار تھا۔ لیکن یہ شعر بار بار پڑھ کر مجھ سا خشک مزاج بھی سوچ میں پڑ گیا :

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اس بے خودی میں غالب نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ہمارے لیے اپنے کلام میں مناظرِ قدرت اور تصوف اور صبر و ہمت اور انسانی فطرت کے کئی اور موضوعات پر ایسی لاجواب

چیزیں چھوڑیں کہ اُن سے ہمارا گرتا ہوا معاشرہ بھی کچھ سنبھل گیا اور محاکات کا یہ حال ہے کہ ہر فرد نے بھی اپنی جگہ محسوس کیا کہ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' !

بعض زبردست نقاد یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ غالب کا کلام قنوطیت سے بھرا ہوا ہے اور اس کے ثبوت میں یہ شعر بھی پڑھا گیا ہے :

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا !

ذاتی طورپرمیں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس شعر سے حوصلہ افزائی اور خوش اُمیدی کی دولت پائی ہے ۔ غالب جہاں غم کا بھی ذکر کرتا ہے تو اُس سے وہ ایک راست باز دل کو حوصلے کا سبق دیتا ہے :

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

مطلب یہ ہے کہ غم سے گریز کرنا غم کا علاج نہیں ۔ غم تو زندگی کے لیے ضروری ہے ۔ غم نہ ہو تو خوشی بے معنی ہو کر رہ جائے جیسے رات کی تاریکی اور عزلت نہ ہو تو دن کی روشنی اور رونق سب ختم ہو جائے ۔ یہ حقیقت بینی ہے یاسیت یا غم پسندی نہیں ۔ ایک صحیح قسم کے مفکر یا

مومن کے لیے غم دل کی تقویت کا باعث بنتا ہے - غالب ہزار دقتوں میں گھر کر بھی مسلسل کوشش کا علم بردار ہے :

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

غالب آسانیاں نہیں ڈھونڈتا وہ مشکلوں کو آسان کرنے کے در پے رہتا ہے :

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وہ نا اُمیدی کو للکارتا ہے :

بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

وہ یہ کہہ کر ہمیں ہمت پر اُکساتا ہے :

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

دردِ زندگی کی اُس نے کیسی لاجواب دوا تجویز کی ہے - اس شعر کو سنیے جو مجھ سے ہزاروں نے سینکڑوں بار دہرایا اور گنگنایا ہوگا اور دیکھیے کہ اقبال کے آنے سے کم از کم

نصف صدی پہلے غالب نے عشق کے تصور کو کس طرح پاک و صاف کر دیا تھا :

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا !

وہی غم میں صبر و ہمت کی تلاش اور کسی کے رنگین تصور میں بے خودی و انہماک کا سبق - اور سنیے زندگی اور حقیقت شناسی پر کیسا لاجواب تسلی بخش متصوفانہ فیصلہ ہے لفظی و معنوی دونوں لحاظ سے خوبصورت اور حوصلہ پرور :

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پر وہ ہے ساز کا

حقیقت کی تلاش کاوش کا سبب کیوں بنے ؟ خدا کو جا بجا کیوں ڈھونڈتے پھریے وہ تو ہمارے دل ہی میں موجود ہے اور جو حجاب سا محسوس ہوتا ہے اُس کے اندر مطلوب کا جلوہ ہے - حجاب اُٹھا دیجیے ، قصہ ختم !

نیکی بدی کے مسئلے پر خوب کہا ہے :

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

کثرتِ ایمان کو کیسے وحدت کا سادہ حل بتا دیا ہے :

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اور شیخ و برہمن کے سب جھگڑے یوں طے کر دیے :

وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

خدا کی بے نیازی پر کیسی نیاز مندانہ تنقید ہے :

زندگی اپنی جو اس شکل کے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے !

اور

"کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا"

ملائیت پر ایک اسی طرح کی اور چوٹ ہے جو خدا نمائی کی طرف ایک نیا اقدام بھی ہے :

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

بلکہ طور سے بھی آگے :

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے غالب غم میں امید کا اور مشکلات میں ہمت کا اور اپنے فلسفے میں صحیح قسم کی معرفت کا پیغام دیتا ہے ۔ یہ ہے وہ چیز جو میں نے غالب سے پائی ہے ۔ بیک وقت زبان کی روانی ہے اور خیالات کی بلندی

جو دل میں جگہ پا لیتی ہے ! ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے غالب کے کئی سنجیدہ شعروں میں بھی ہلکی پھلکی ظرافت یا طنز ہوتی ہے جو بہت پر لطف ہے ۔

ایک دفعہ سر راس مسعود اور میں اکٹھے بیٹھے غالب پر باتیں کر رہے تھے کہ ہم دونوں نے کہا کہ آؤ مل کر غالب کا بہترین شعر چنیں جو ہمیں پسند ہو ۔ ہم دونوں کا خیال ان دو شعروں کی طرف گیا جو ایک لحاظ سے فی الحقیقت ایک ہی شعر ہیں ۔ ہم نے کہا بس یہ غالب کے بہترین شعر ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی دماغ کا فیصلہ نہ تھا بلکہ دل کا فیصلہ تھا ۔ یہاں تنقید نے کام نہ کیا بلکہ جذبۂ احساس اور اشتیاق حسن نے :

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے !

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے !

اکثر لوگ آہیں بھرتے ہیں کہ ہم تو محبوب پر مرتے ہیں لیکن وہ ہم سے بے پروا ہے ۔ اکثر لوگ اس بات کے بھی شاکی ہیں کہ ہائے بہار کتنی جلد ختم ہو جانے والی شے ہے ۔ غالب کا حقیقت بیں حساس دل اس کے برعکس نگار کے حسن کو دیکھتا ہے اور دیکھتا ہی رہتا ہے اور اکثر اس سے آگے

قدم اُٹھانا ضروری نہیں سمجھتا اور نہ وہ بہار کو دیکھ کر اس خیال سے آہیں بھرتا ہے کہ ہائے وہ تو بہت جلد ختم ہوجائے گی - اپنے بہترین کلام میں وہ ماضی و حال اور مستقبل سب میں عموماً حال پر نظر رکھتے ہوئے اس سے لطف اندوز ہونا کافی سمجھتا ہے - کتنا بلند خیال ، کیسی پاکیزگی ، کیسا ترنم کیسا ضبط اور کیسی بے غرضانہ محبت ہے - یہ ہے حقیقت میں جذب ہو جانا اور پھر اُسے اپنے میں جذب کر لینا !

یہ ہے وہ خزانہ جو میں نے غالب میں پایا ہے - یہ ہے دین و دنیا کی زندگی کا نچوڑ - اس میں تنقید کو کم دخل ہے- اس پر اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے :

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

غالب کے سارے دیوان کے بال کی کھال نہ اُتارئیے - بس اُس پر کبھی نظر ڈالیے اور اُسی نظر میں محو ہو جائیے -

ڈاکٹر محمد وحید مرزا

غالب کا شمار آج کل اردو کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے ، بلکہ بہت سے لوگوں کی رائے میں انھیں اولیت کا شرف حاصل ہے، لیکن غالب کی اس عام شہرت اور مقبولیت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ، کیونکہ اس کا آغاز تقریباً بیسویں صدی کے دوسرے دس سالوں ، یعنی ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء کے قریب ہوا اور شروع میں چند نوجوان ادیبوں نے جن میں عبدالرحمان بجنوری پیش پیش تھے ، غالب کی عظمت کا اندازہ کیا اور ان کے کلام کی گونا گون خوبیوں کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ، چنانچہ ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے لوگ غالب کی بزرگی کا دم بھرنے لگے اور ان کے کلام کی طرف پیش از پیش توجہ شروع ہو گئی ۔ غالب کے کلام سے میرا اپنا تعارف صحیح معنوں میں ۱۹۱۶-۱۹۱۸ء میں ہوا ۔ میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں پڑھ رہا تھا ۔ ہمارے گھر میں مولانا حسرت موہانی کی لکھی ہوئی دیوان غالب کی شرح کا ایک نسخہ

کہیں سے آ گیا تھا ، اسے بڑھنے کا شوق ہوا اور اس کے مطالعے میں اس قدر لطف محسوس ہوا اور اتنی دل چسپی بڑھی کہ اردو کے دوسرے شعراء کا کلام پھیکا اور بے مزہ معلوم ہونے لگا ، چنانچہ غالب کی زیادہ تر معروف غزلیں زبانی یاد ہو گئیں اور ان میں سے بہت سی ابھی تک یاد ہیں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ہمارے کالج کے پروفیسر شیخ نور الہٰی صاحب نے ، جو کالج کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں ہمیشہ بہت دل چسپی لیتے تھے ، کالج کے طلبہ کو غالب کے کلام پر ایک مبسوط مقالہ لکھنے کی دعوت دی اور بہترین مقالے پر انعام دینے کا وعدہ فرمایا ۔ میرے منجھلے بھائی خورشید نے ، جو اس وقت تک ایم ۔ اے کر چکے تھے اور جنھیں انگریزی ، فارسی اور اردو شاعری سے خاص شغف تھا بلکہ ان تینوں زبانوں میں خود بھی اچھے شعر کہہ لیتے تھے ، مجھے کہا کہ میں بھی اس مقابلے میں شریک ہوں ۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم مایگی کا احساس تھا اور یہی خیال تھا کہ میرا مقابلہ بعض ایسے طلبہ سے ہوگا جو مجھ سے سینیر تھے اور زیادہ قابل تھے اور اس لیے میری کامیابی کے امکانات بہت کم رہ جائیں گے ، لیکن ان کی ترغیب و تحریص سے میں نے کمر ہمت باندھی اور اللہ کا نام لے کر مضمون لکھنا شروع کر دیا ۔ اس کی تیاری میں وہ برابر میری مدد کرتے رہے اور مفید مشورے دیتے رہے ۔ آخر مقالہ تیار ہو گیا اور میں

نے اسے پروفیسر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا - چند روز بعد نتیجے کا اعلان ہوا اور میری توقع کے بالکل بر خلاف انعام مجھے ہی ملا - انعام کی رقم زیادہ بڑی نہ تھی لیکن مجھے جو خوشی اس کامیابی سے ہوئی وہ ابھی تک یاد ہے اور اس روپے سے جو کتاب میں نے خریدی تھی وہ بھی تا حال میرے پاس محفوظ ہے اور زمانہ رفتہ کی ان یادگاروں میں سے ایک ہے جو مجھے بہت عزیز ہیں -

غالب کی مقبولیت کا راز کیا ہے ؟ اس کے بارے میں یہاں کسی تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں ہے - گذشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کسی اور اردو شاعر کے بارے میں نہیں لکھا گیا ، اور اگرچہ زمانہ حال میں بعض اور شعراء ، مثلاً میر تقی میر ، مومن ، سودا ، انیس وغیرہ کے کلام کی جانب بھی بہت توجہ کی گئی ہے لیکن کسی اور شاعر کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر اتنی سیر حاصل بحث نہیں کی گئی - اس معاملے میں اگر کوئی غالب کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ اقبال ہیں جو خود غالب کے مداح اور ان کی عظمت کے معترف تھے - للہذا اس مختصر سے مضمون میں صرف ان چند تاثرات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرونگا جو مجھے غالب کے مطالعے سے حاصل ہوئے - سب سے پہلی چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ غالب کی جدت

پسندی اور غزل کی قدیم روش سے ان کی بغاوت ہے ۔ یہ بات ان کے اسلوب تحریر میں اتنی ہی نمایاں ہے جتنی کہ ان کے خیالات میں ، فارسی ترکیبوں کا استعمال اس طرح کہ وہ اردو میں غیر مانوس اور بے ربط نہ معلوم ہوں بلکہ ان کی وجہ سے ایک خاص قسم کی عبارت کی روانی ، بندش کی چستی اور اسلوب کی پختگی پیدا ہو جائے ، ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ۔ اس سے اردو شاعری میں ایک نئی کفیت اور تازگی پیدا ہو گئی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے بعض اشعار میں فارسی ترکیبوں کا استعمال حداعتدال سے تجاوز کر گیا ہے جس کی وجہ سے ایک طرح کی ثقالت اور تعقید پیدا ہوگئی ہے ، مثلاً ان کے اس شعر میں کہ :

شمار سبحہ مرغوبِ بت شکل پسند آیا
تماشای بیک کف بردنِ صددل پسند آیا

لیکن ایسے اشعار غالب کے دیوان میں گنتی کے ہیں اور وہ بھی ان کی مشق سخن کے ابتدائی دور کے ۔ اس کے برخلاف زیادہ تر اشعار میں اردو اور فارسی کا امتزاج ایک مناسب حد کے اندر ہے اور بہت خوش آیند ہے، اور مجھے ان کا یہ دعوی کہ :

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

بالکل صحیح معلوم ہوا۔ ان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے بیحد متأثر کیا ان کی دعوتِ عمل ہے اگرچہ بعض اوقات عالم یاس میں وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا

یا انسان کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھ کر ان کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ:

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

لیکن وہ انسان کی سعی اور کوشش کو بیکار نہیں سمجھتے بلکہ ناکامی میں بھی ایک لذت محسوس کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ:

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

اور انسان کو سرگرم عمل رہنے کی ترغیب یوں دیتے ہیں کہ:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

پھر ان کی نظر میں انسان کی جو قدر و منزلت اس کائنات کے اندر ہے اس کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ :

دیکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

اور اسی خیال کو تغزل کے رنگ میں یوں پیش کرتے ہیں کہ:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

گویا دوسرے الفاظ میں وہ انسان کو احساس خودی و عزت نفس کا درس دیتے ہیں ۔ یہ بات ان کی شاعری کی ان خصوصیات میں سے ہے جنھوں نے مجھے اس زمانے میں خاص طور پر متاثر کیا ۔

دنیا کی بے حقیقتی اور لذات دنیوی کی بے ثباتی کا ذکر ہمارے سب ہی شاعر کرتے چلے آئے تھے ۔ غالب بھی وجود باری تعالی کو ایک تنہا حقیقت سمجھتے تھے اور خدا کی وحدانیت مطلق کے قائل تھے ، چنانچہ کہتے ہیں کہ :

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بوبھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

لیکن وہ مظاہر دنیوی کو بھی بے حقیقت اور سراب محض نہیں سمجھتے :

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

گویا ان کے نزدیک ہمارے گرد و پیش جو چیزیں ہیں انھیں محض بیکار اور بے حقیقت سمجھنا غلط ہے۔ ان کے اس نقطۂ نظر سے میری طرح ہر انسان ضرور متاثر ہوا ہوگا۔

اردو شاعری میں عشقیہ اشعار کی بھرمار ہے بلکہ ہمارے کلاسیکی شعراء کے کلام میں اکثریت اسی نوعیت کے اشعار کی ہے، غالب کا کلام بھی اس چیز سے خالی نہیں، لیکن عشق و محبت کے جذبات اور واردات قلبی کے بیان میں بھی جو شگفتگی اور جاذبیت غالب کے کلام میں پائی جاتی ہے اس کی مثال کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام میں بہ مشکل ہی ملے گی، مثلاً ان کی اس غزل:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

کا ہر شعر ایسا ہے کہ جو ایک خاص کیفیت اوراثر میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر انسان، خصوصاً ہر نوجوان، کے دل پر ایک ایسا گہرا نقش چھوڑتا ہے جو کبھی محو نہیں ہو سکتا آخر میں غالب کی وہ خصوصیت جس نے مجھے بے انتہا متاثر کیا یہ ہے کہ ''پابستگی رسم ورہ عام'' کرتے ہوئے ، یعنی ''ظرف تنگنائے غزل'' ہی کو ذریعہ اظہار خیالات بنا کر ، انھوں نے اپنے ڈیڑھ دو جزء کے مختصر سے دیوان میں مضامین کی اتنی وسعت ، اتنا تنوع اور اس قدر ہمہ گیری پیدا کردی ہے جو یقناً حیرت انگیز ہے اور ان کے اس دعوے کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اسی مختصر سے دیوان کے بل پر انھوں نے ریختہ کو فارسی بنا دیا ہے۔ فلسفیانہ اور متصوفانہ مضامین کے علاوہ ، قلب انسانی کی مختلف کیفیات ، حسرت ویاس ، رنج و الم ، راحت و سکون ، امید و بیم ' غرض یہ کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو یا گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے بارے میں کوئی نہ کوئی شعر اس دیوان میں نہ مل سکے۔ کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو

شاعری کی عظمت کا احساس اور اس کا صحیح ذوق مجھے بہت حد تک غالب کے کلام کے مطالعے ہی کی بدولت حاصل ہوا ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری سے متعلق جن دو کتابوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ دیوان غالب اور مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات تھی -

علی عباس حسینی

کردار اور سیرت کے بننے کا زمانہ یقینی طور پر عہدِ طفولیت ہوتا ہے - ہمارے والدین ہمیں جس طرح کی تربیت دیتے ہیں، ہم جس طرح کے ماحول میں پلتے اور بڑھتے ہیں، ہمارے گردو پیش اعزاء اور ہمسائے جس طرح کی زندگیاں بسر کرتے ہیں، ہمیں درس میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ہمارے معلمین جس مزاج اور طبعیت کے ہوتے ہیں اور جس ڈھنگ کا سلوک وہ ہم سے روا رکھتے ہیں، ان سب سے ہم اثرات قبول کرتے ہیں اور یہی ہماری سیرت کی نشو و نما کی بنیادیں ہوتی ہیں - میں مولویوں کے گھرانے میں پیدا ہوا، مگر خدا کا شکر ہے کہ بزرگ بالکل قل اعوذئے نہ تھے - اس لیے گو ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی مگر انگریزی کی طرف میرا رجحان دیکھ کر کسی نے انگریزی اسکول میں داخلے کی مخالفت نہ کی - میری سیرت کو اگر کسی کتاب نے متاثر کیا تو وہ سعدی کی گلستاں تھی اور فقہ میں جامع عباسی اور میرے ذوق ادب و زبان کی اگر کسی صنف سخن نے آبیاری کی تو وہ مراثی انیس و نفیس و وحید

تھے۔ غزل گو شعرائے اردو سے میں اسکول میں پہنچ کر متعارف ہوا۔ مگر یہ واقفیت بہت ہی محدود تھی۔ مٹریکولیشن تک کورس میں چند منتخب شعرا کی چند منتخب غزلیں تو ہیں۔ میرے زمانے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو ادب کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔

لیکن خوش قسمتی سے ایف۔ اے اور بی۔ اے کی تعلیم کے لیے لکھنؤ جیسے مرکز شعرو سخن میں آنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شعرو شاعری کا ہر جگہ چرچا رہا کرتا تھا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی انجمن کی طرف سے ایک مشاعرہ ضرور ہوتا اور سال میں دو تین بڑے بڑے مشاعرے جن میں دور دور سے نامور اور مشہور شعرا شرکت کے لیے تشریف لاتے تھے۔ غرض ان مشاعروں میں شرکت، یہاں کے ممتاز شعرا کی خدمت میں باریابی کے شرف، زبان سیکھنے کے شوق اور اپنے ہاں کے شعرا کے کلام میں تفکر اور جدت کی تلاش نے میری غالب تک رسائی کرائی۔ اور وہ جس کا تجسس تھا اور جس کی تلاش تھی، یعنی تفکر، تنوع، بلند پروازی، جدت طرازی، مرصع کاری، حسن بیان، رفعت حوصلہ، خود داری، معراج تخیل کے ساتھ ساتھ شوخی، طنز، بانکپن اور انداز بیان میں نیا پن، یہ ساری خوبیاں اس ایک اکیلے کے کلام میں مل گئیں۔ پھر تو غالب کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ

تقریباً پورا دیوان حفظ ہوگیا ۔ اور موقع موقع سے اس کے اشعار زبان پر آنے لگے ۔ اور اب محسوس ہونے لگا جیسے اس نے اپنے اشعار میں ان جذبات و حسیات کو بیان کر دیا ہے، جو میرے دل کی تہوں میں چھپے بیٹھے تھے ۔ بقول اسی کے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس لیے اس کے اشعار کے بر محل استعمال نے بعض وقت لطائف جیسا مزہ دیا ۔ کچھ واقعات آپ کے ناظرین کے نفس طبع کے لیے حاضر ہیں ۔

۱ - بہار کے ایک جلیل القدر بزرگ، وا سرائے کے ایکزیکٹیو کانسل کے ممبر مقرر ہوئے ۔ اور محکمہ اطلاعات ان کے سپرد ہوا ۔ مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اور ان کے بھتیجے اور متبنی صاحبزادے کی وساطت سے قرابت کا شرف بھی ۔ ایک دوست نے اصرار کیا کہ ان کے لیے محکمہ کی ایک اچھی اسامی کے لیے سفارش کر دوں۔ چنانچہ میں نے حاضر خدمت ہو کر پرزور وکالت کی اور ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ میرے دوست کی درخواست پر بہ ہمدردی غور فرمائیں گے ۔ جب میں خوش خوش سلام کرتے کمرے سے باہر نکلنے لگا تو ان کے صاحبزادے نے قرابت کے جوش میں آ کر مجھ پر خفگی

کا اظہار کیا کہ "ہونہہ! دوسروں کی سفارش کے لیے دوڑے چلے آئے اپنے لیے نہیں کہا گیا ۔اس جگہ کے لیے تو تم ان صاحبزادے سے کہیں زیادہ سوزوں ہو۔" چونکہ یہ ڈانٹ اتنے زور سے بتائی گئی تھی کہ ان کے والد محترم نے بھی سن لی تھی اس لیے میں سٹ پٹاسا گیا۔ لیکن غالب نے بر محل رہنمائی کی۔ میں نے عرض کیا۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہہ جام بہت ہے؟

اس پر خفا ہونے والے عزیز تو سر کھجانے لگے مگر بزرگ محترم کی آنکھوں میں خوشنودی کی ایک جھلک دکھائی دی اور انھوں نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ اور میں کمرے سے نکل کر غالب کا ایک اور شعر گنگناتا گھر چلا آیا۔

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

۲۔ (الف) بارہ برس میں نے جوبلی کالج لکھنؤ میں معلمی کے فرائض بسر کیے۔ علامہ اختر علی تلہری اور خواجہ اطہر حسین فلسفی جیسے افاضل مخلصین میں تھے۔ ہم تینوں اکثر ملی و مذہبی مسائل پر سر فراز اخبار

میں مضامین لکھا کرتے تھے ۔ موضوع اکثر ویسے تو توہمات ہوتے تھے جو مذہبی مراسم میں داخل ہو گئے ہیں اور جو عقلی حیثیت سے نہ درست ہیں اور نہ ملت کے لیے سود مند ۔ ظاہر ہے کہ خوش عقیدہ لوگوں کو ہماری یہ حرکت حد درجہ نا گوار گزرتی تھی ۔ ایک نوجوان تعلقہ دار تو اس درجہ برہم تھے کہ وہ ہمیں ہمیشہ ملحدین جوبلی کالج کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے ۔ بعض مذہب پرست خفا ہو کر ان مضامین کا جواب لکھتے اور سب و شتم سے کام لینے میں بھی نہ چوکتے ۔ یہ باتیں علامہ تلہری کو جو خود بھی عربی کے فاضل تھے اور علم کلام پر نظر غائر رکھتے تھے، غصہ دلا دیتی تھیں اور ان کے تلہری خون کی حرارت ان کی متانت پر غالب آ جاتی تھی، تو ہم انھیں تلخ نوائی سے باز رکھنے کے لیے ہمیشہ کہتے ۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

(ب) اسی زمانے میں میرے ایک ہم وطن نے ایک واعظ کا اسم گرامی لے کر فرمایا کہ وہ تم لوگوں کو حد درجہ برا بھلا کہہ رہے تھے ۔ بلکہ انھوں نے یہاں تک فرمایا کہ ''شاہی نہ ہوئی ورنہ ان لوگوں کی زبان

گدی سے کھنچوالی جاتی !" - میں نے بے ساختہ غالب
کا یہ شعر پڑھ دیا -

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

وہ بھی صاحب ذوق تھے، بر محل شعر پر بھڑک اٹھے، بات کا رخ پلٹ گیا اور غالب کے کلام کے محاسن پر گفتگو ہونے لگی -

(ج) اسی زمانے میں ایک مولوی پرست بزرگ سے ایک مسئلہ کے متعلق گفتگو کے سلسلے میں میں نے انھیں ایک شرعی نکتہ کی طرف توجہ دلائی - وہ تعجب سے بولے "اچھا، تو تم کو باوجود انگریزی دان ہونے کے، اس شرعی حکم کا بھی علم ہے !" -

میں نے عرض کیا "قبلہ میں بھی اسی حوض کا کیڑہ ہوں جس میں آپ غوطہ و طہارت فرماتے رہتے ہیں" اور بیساختہ غالب کا یہ شعر زبان پر آ گیا -

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

۳ - کوئی پانچ سال قبل کا واقعہ ہے کہ ایک وزیر صوبہ کی خدمت میں ایک انجمن کے کام سے جس کے وہ صدر اور میں سکریٹری تھا، حاضر ہوا - اس وقت وہاں کچھ اور وزرا بھی بیٹھے ہوئے تھے - اس لیے "سکیورٹی" کے

سپاہیوں نے ، جو مجھے پہچانتے نہ تھے ، بنگلے کے اندر جانے سے روک دیا مجھے ناگوار سا گزرا اس لیے میں نے اپنا رکشا فوراً مڑوا لیا مگر چلتےوقت اپنے کارڈ کی پشت پر عرفی کا یہ مطلع لکھا :

از در دوست چہ گویم بہ چہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اور سپاہی کو کارڈ دیکر کہا ''اسے صاحب کے ہاں اندر بھجوا دینا" - اور گھر چلا آیا -

دوسرے دن جب وزیر موصوف سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا ''تم فوراً کیوں چلے گئے ؟ اندر آ کر پی - اے کے پاس بیٹھ جاتے ، وہ لوگ تو دس منٹ بعد ہی چلے گئے تھے" -

میں نے عرض کیا :

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے !

وہ بھی صاحب ذوق تھے - بڑی دیر تک اس شعر کو پڑھتے اور جھومتے رہے -

میں نے کہا ''گستاخی ضرور ہے ، مگر اسی کا ایک اور شعر جو میرے حسب حال ہے وہ بھی سن لیجیے"

انھوں نے فرمایا ''ضرور ، ضرور سناؤ - کیا کہا ہے اس

ظالم نے؟"

میں نے عرض کیا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

فرمایا "واللہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کے شعر کی کن الفاظ میں داد دوں اور تم سے جو سپاہی نے گستاخی کی اس کی معافی کن الفاظ میں مانگوں"۔

میں نے عرض کیا "میرا ذکر چھوڑیے، بس شعر سے لطف لیجیے"۔ اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

۴۔ جوبلی کالج لکھنؤ میں بارہ برس متعلمی کے فرائض ادا کرنے کے بعد میرا تبادلہ کانپور کر دیا گیا۔ ایک مہربان حاکم بالا دست کی خدمت میں اس تبادلے کی منسوخی کی غرض سے حاضر ہوا۔ ان کرم فرمانے فرمایا کہ "ایک کالج میں مسلسل بارہ برس رہ چکے، یہ سرکاری قانون کے خلاف ہے۔ لکھنؤ کے علاوہ جہاں کہو بھیج دوں"۔

میں نے عرض کیا۔

"جب میکدہ چھٹا ہے تو پھر کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو!"

گو میں محروم پلٹا لیکن غالب کے شعر نے مجھ میں ایک

طرح کی توانائی پیدا کر دی۔

۵ - سال پیوستہ میرا منجھلا لڑکا اپنی دلھن کو لیکر امریکہ سے آیا۔ ٦ دسمبر کی صبح کو امریکی دلھن ہندوستانی مراسم کے ساتھ ہندوستانی لباس میں گھر میں اتاری گئی - ۷ دسمبر کی صبح آئی تو بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد ، بڑی بہو کے ہاں اسپتال میں بچی پیدا ہوئی مگر مری ہوئی ، ساری خوشیوں پر پانی پھر گیا۔ گھر بجائے مسرت خانہ کے عزا خانہ بن گیا۔ احباب و اعزا جو مبارک باد دینے آئے تھے تعزیت کے فرائض ادا کرنے لگے۔ مجھ سے جس سے بھی گفتگو ہوئی میں نے غالب ہی کا یہ شعر پڑھا۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی!

٦ - میں نے اپنا وطن ترک کر کے لکھنؤ کا قیام اختیار کیا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ عمر کے ۷۲ برسوں میں ٦۲ سال شہر میں گزارے ہیں اور ان کے بھی تقریباً باون برس صرف لکھنؤ میں۔ اس لیے دیہات کی زندگی بسر کرنا ، اور وہ بھی خاتمہ زمینداری کے بعد بہت دشوار ہے۔ دوسرے ارباب وطن کا سلوک بھی غالب کے اس شعر کا مصداق ثابت ہوا۔

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اس لیے عجب نہیں کہ مرتے وقت اسی نابغہ کا یہ شعر زبان پر جاری رہے۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم!

جسٹس ایس - اے رحمٰن

میری طالب علمی کا زمانہ تھا - بھوپال سے شائع شدہ دیوانِ غالب کے نسخۂ حمیدیہ کا بڑا چرچا ہوا - بڑے شوق سے کسی سے عاریتاً لے کر دیکھا - ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے لکھے ہوئے مقدمے کا پہلا فقرہ چونکا دینے والا تھا - انھوں نے لکھا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، "وید مقدس" اور "دیوانِ غالب" - مقدمہ پڑھ کر سخت مرعوبیت کی کیفیت طاری ہوئی - ذہنی طور پر وضو کیا اور با ادب دیوان کا مطالعہ شروع کیا - جگہ جگہ غالب کی مشکل پسندی کی وجہ سے ٹھوکر کھائی - سنبھل سنبھل کے آگے بڑھتا گیا - جب ایسے اشعار پر نظر پڑی ، جن سے امرد پرستی کی بُو آتی تھی یا جو نگارِ ہرجائی سے نوک جھونک پر مشتمل تھے یا جن میں اربابِ اقتدار کی بے جا مدح سرائی تھی تو میرے نا پختہ ذوق نے بھی انھیں الہامی درجہ دینے سے اِبا کیا - احساس یہ ہوا کہ اس بیشہ میں خشک و تر کی آمیزش ہے اور اس خشک و تر کا تنوع بھی نظیری نیشاپوری[1] کے

---

۱ - نظیری کا شعر ہے :

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

تصور سے مماثل نہیں ، جس میں ہر نخل اگر منبر نہیں بن سکتا تو اوجِ دار تک پہنچ جاتا ہے ۔ لہٰذا مجھے یوں نظر آیا کہ بجنوری مرحوم کے مقدمے میں ایک عظیم شاعر کے لیے جذبۂ تحسین ادبی توازن پر غالب آ گیا ہے ۔ شاید ان سقیم یا پست قسم کے اشعار کی ذمہ داری کسی حد تک غالب کے سماجی ماحول اور ماضی کی ادبی روایت پر ڈالی جا سکے ۔ لیکن اگر انھیں کسی معنی میں الہامی شمار کرنا پڑے تو پھر گاہے سروش کے غلط آہنگ ہونے کا امکان مشکل ہی سے رد کیا جا سکتا ہے ۔

تاہم دیوان میں اس نا ہمواری کے باوجود (اور کس عظیم شاعر کے ہاں نا ہمواری نہیں ہے ؟) کلامِ غالب نے بہ حیثیتِ مجموعی میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ۔ اس وقت تک اردو ادب کے سرسری مطالعے نے میرے ذہن میں ، عصری اردو شاعری سے قطعِ نظر ، مغربی ادب کے مقابلے میں اردو شاعری کا کوئی وقیع تصور قائم نہیں کیا تھا ۔ غالب کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت دل نشیں ہوتی گئی کہ ہمارے پیش رووں کی شاعری میں بھی محض پند و نصائح ، رونا اور دانتوں کا پیسنا ، یا مصنوعی حسن و عشق کے معاملات ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش مقامات بھی ہیں ۔ انفس و آفاق کے مشاہدہ پر مبنی حقیقتیں بھی جلوہ افروز ہیں ۔ تخیل کی شاداب مگر فلک شگاف بلندیوں کے مناظر بھی ہیں ۔ مۓ مرد افگنِ عشق سے آنکھیں لڑانے اور اس سے

نشاطِ زندگی کے حصول کا خود دارانہ حوصلہ بھی ہے اور فکر و جذبہ کی نیرنگیوں کے ساتھ ساتھ ، اظہار و بیان کی شوخیاں اور رنگینیاں بھی جاذبِ قلب و نظر ہیں ۔

آہستہ آہستہ میرے شعور میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ جنسِ نابغہ پر کسی خاص زبان و ادب کا اجارہ نہیں ہے ۔ اپنے اپنے ماحول اور اس کی روایات کے حلقے میں رہ کر بلند فکر شعرا نے ہر زبان میں روحانی تجربوں اور مسرتوں کا خزینہ اپنے اخلاف کے لیے چھوڑا ہے اور ایسے لوگوں کی تخلیقات زمان و مکان کی حد بندیوں کو توڑ کر جدید ذہن کی پرپیچ تہوں میں سرایت کر کے ، ہل چل مچا سکتی ہیں ۔ میرے لیے یہ انکشاف مسرت آمیز تھا کہ انیسویں صدی کے وسط کا ایک اردو شاعر اگر ایک طرف خونِ گرمِ دہقاں میں برقِ خرمن کا ہیولئی دیکھ سکتا ہے اور یوں ہیگل کے اصولِ جدلیت کی پیش بینی کر سکتا ہے تو دوسری طرف وہ زندگی کے رجائی پہلو پر نظر جما کر ، اس کی کٹھن منزلوں کو منور کرنے کے لیے یہ بھی کہہ سکتا ہے ۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اُس کی عالی ظرفی کا یہ عالم ہے اُسے مزدِ بندگی قبول کرنے سے بھی عار ہے :

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

وہ اس دنیائے فانی کے نا پایدار جمالیاتی اثاثے کو غنیمت جان کر زندگی کے ساتھ یوں سمجھوتا کر سکتا ہے :

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

اور اسے پر خار راہیں بھی دعوتِ تشکر دیتی ہیں :

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

اپنے ماضی پر ایک نگاہِ بازپسیں ڈالتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ غالب نے نہ صرف میرے فرصت کے لمحات کے لیے سامانِ اہتزاز مہیا کیا بلکہ میرے دل میں اپنے پرانے ادبی ورثے کا احترام بھی بحال کیا اور میری نظروں میں اس کا یہ کارنامہ اس لیے شاعروں کے اس زمرہ میں شامل کرنے کے لیے

کافی ہے جن کا لطفِ کلام اس دعویٰ کی دلیل بن سکتا ہے کہ - ع

شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

غالب کی شاعری میں ، میرے لیے : سب سے زیادہ تاثر پیدا کرنے والی بات اُن کی وسیع المشربی ہے - ایسی وسیع المشربی جو آفاقی قدروں کو گلے لگاتی اور انسانی دوستی کا دم بھرتی ہے میں نے بہ حیثیت معلم (اور طالب علم) جب بھی کلام غالب پر نظر ڈالی ہے تو مجھے لبرل ایجوکیشن کے جملہ اوصاف اس شاعری میں نظر آتے ہیں -

غالب کی ذات اس اعتبار سے لبرل ہے کہ وہ ہر طرح کی فرقہ بندیوں سے بالا تر ہیں - مذہب کے معاملے میں اُن کا ذہن تعصبات سے پاک ہے - علم کے باب میں اُن کا فکر ہمیشہ نئے خیالات قبول کرنے پر آمادہ ہے - کلچر یا تہذیب میں ان کی وسیع المشربی اس لیے مسلم ہے کہ ذہن کی تربیت اور فکر کی رفعت ان کا مدعا ہے - رواجی اور پیشہ ورانہ تہذیب ان کے مزاج کے خلاف تھی -

غالب تو شاعری کی اُس تعریف پر پورے اُترے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ شاعر اپنے خیالات کی ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے - ایسی دنیا جو مادی دنیا سے بلند اور اس سے

ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے - فکر کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ہم رفعت کی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جسے Sublimity کا نام دیا گیا ہے :

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش آشیاں اپنا

بعض لوگ شاعر کو فلسفی کہہ کر اور اس کے کلام کو ایک یا کئی فلسفوں کا ترجمان سمجھ کر بہت خوش ہوتے ہیں - میرے خیال میں شاعر کا منصب منطقی فلسفہ داں سے مختلف ہے - افکار خواہ کتنے ہی فلسفیانہ کیوں نہ ہوں اگر خیال میں شعر کی دلآویزی یعنی ذہن کے ارتعاش میں دل کی دھڑکن شامل نہیں تو اسے خواہ کلامِ موزوں کہہ لیجیے ، سخنِ دل پذیر ہرگز نہیں کہہ سکتے اور شعر و سخن دل پذیر نہیں تو کچھ بھی نہیں -

غالب کسی مکتبۂ فکر کے مقلد یا مبلغِ بن کر شاعری نہیں کرتے - نہ اس سے ان کے خیال میں شاعر کی آبرو بڑھتی ہے - غالب نے ذہن کی دقیق اور فلسفیانہ مو شگافیوں کو بھی جب شعر کے قالب میں ڈھالا تو اثر آفرینی پر ہرگز حرف نہیں آنے دیا - ذہن کی بات کو دل کی بات بنا کر نشاطِ خاطر کا سامان فراہم کیا -

ان کے یہاں عقلیت ضرور ہے مگر کسی مسلسل نظام فکر کی تدوین کے لیے نہیں - وہ اعلیٰ اخلاقِ انسانی کے گرویدہ

ضرور ہیں مگر کوئی دستورِ اخلاق مرتب کرنے کے خواہش مند نہیں۔ وہ اصلاحِ عمل کے قائل ضرور ہیں مگر مصلح کا روپ دھارنے پر رضا مند نہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی منصب شاعر کا منصب نہیں ہے۔ غالب ایسے ریو و ریا سے دور بھاگتے ہیں۔

اس پر گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالب خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

فلسفہ دانی کے متعلق مثلاً یہ شعر:

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یہاں غالب کے نام سے کوئی فلسفہ تعبیر کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ عبادت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ عبادت جو جنت کے لالچ سے کی جاتی ہے۔ یہ عبادت نہیں تجارت ہے۔ دوسری وہ عبادت جو دوزخ کے خوف سے کی جاتی ہے۔ یہ عبادت نہیں کمزوری ہے۔ تیسری وہ عبادت ہے جو محض اس لیے کی جاتی ہے کہ خدا کی ذات عبادت کے لائق ہے۔ یہ سچی عبادت ہے۔ مگر اول تو یہ نظریۂ عبادت غالب کا تخلیق کردہ نہیں ہے، پیغمبروں کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ عبادت کا متذکرہ بالا مفہوم لے کر چلنے والے جنت کی طمع اور جہنم کے خوف کی عبادت کو روا سمجھتے

ہیں ۔ غالب ان کے مقابل ہو کر کسی موقف کی تشہیر کا داعی نہیں ہے وہ تو آزادمنش ہونے کی وجہ سے اپنے طور پر اپنے شدید رد عمل کا اظہار کرتا ہے ایسا شدید رد عمل جس کے تحت اسے دوزخ و جنت کا وجود بھی گوارا نہیں ہے ۔ وہ تو گویا خدا کے اس عمل پر کڑھتا ہے کہ آخر ان طمع سازیوں اور دہشت خیزیوں کی ضرورت کیا ہے ؟ اس طرز فکر کو میں غالب کی ذہنی تہذیب (Intellectual culture) کا نام دیتا ہوں جو وسیع الخیال لوگوں کا وصف خاص ہے ۔

غالب کی وسعتِ فکر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کسی کے طرف دار بننے پر آمادہ نہیں ۔ شاعری کے منصب میں وہ انتہائی حق گو بلکہ صاف گو ہیں یعنی جو بات ان کے دل و دماغ کو حق لگے وہی حق ہے ۔ غالب خود اپنے طرف دار نہیں ہیں تو دوسروں کی طرف داری کیوں کریں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ پیشہ کی وجہ سے فرہاد کے نام رکھے جائیں تو غالب سینہ سپر ہو کر سامنے آتے ہیں اور اس کی آشفتہ سری کو نباھتے ہیں ۔ لیکن اگر وہی فرہاد تیشے کا منت کش بن کر مرنے کی تدبیر کرے تو اس کے عمل کی فرسودگی اور رسوم و قیود کی پابندی پر طعنہ زن ہو جاتے ہیں ۔ بے جا روایت کی جکڑ بند سے آزاد ہونا ہی آزاد طبع شاعر کی خصوصیت ہے ۔

غالب اس حد تک آزاد منش ہیں کہ ان کے خیال میں

اگر کوئی اعتراض ذاتِ واجب پر بھی وارد ہوتا ہے تو اُس کو وہ دل میں نہیں رکھتے۔ مسئلہ خواہ معاش کا ہو خواہ معاد کا وہ اپنے منفرد اندازِ فکر اور ممتاز اندازِ تعریض سے نہیں ہٹ سکتے۔ انسان کو جب ذہن ملا تو اظہار رائے کے حق سے وہ دست بردار کیوں ہو تخلیق کا عارضی کھیل ہو یا معاد کا ہنگامہ یہ ایک عالمِ کل اور ذات دانا و بصیر کے لیے کیا ضروری تھا۔ 'ہونے' میں بکھیڑا ہے' نہ ہونے، میں سکون تھا 'نہ ہونے' میں عالم ارواح کے اعلیٰ ترین امکانات تھے۔ اور 'ہوئے' میں عالمِ آب و گل کی ذلتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ خوب بوالعجبی ہے کہ فرشتے جو رتبے میں انسان کے برابر ہیں نہ احساساتِ بشری کو سمجھنے کے اہل وہ اس کی فرد جرم لکھنے پر کیوں مامور ہوں۔ بات ملائیت یا کج بحثی کی نہیں ہے۔ نہ ایسے لوگوں سے انہیں کوئی دلچسپی ہے۔ غالب تو اپنی نہجِ فکر کو دل کی دھڑکنوں کے ساتھ پیش کرنے سے مطلب رکھتے ہیں۔ اس کے لیے موضوع کی کوئی تخصیص یا استثناء بھی نہیں۔ شاعر جو بھی دیکھتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے اسے اپنی انفرادیت کے آئینہ میں دکھاتا ہے۔ بعد میں یہی بے باکی اقبال کے یہاں ابھرتی ہے۔

غالب کے یہاں صرف ایک حصار ہے ـــــ انسانیت کا حصار، جس میں یہ رند ہزار شیوہ کل روشن خیال اہلِ دل کا ہم

مشرب ہے - یہ رند سجدہ گزار بھی ہے مگر ایسے مسجود کا جو ادراک کی سرحدوں سے ماوراء ہے کعبہ و دیر کی حد بندیاں اس کے یہاں بے معنی ہیں - اور غالب سے ——میرا ذہنی رشتہ اسی اساس پر قائم ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ

غالب[1] سے میری نیاز مندی پرانی ہے۔ بہت پرانی ،--- اس وقت سے جب میں ابھی لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر ، پہلی مرتبہ پانچویں جماعت کے نصاب اردو میں غالب سے روشناسی ہوئی اور ابتدا اس شعر سے ہوئی---

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اس شعر کا اس وقت بڑا اثر ہوا ، اس زمانے کو میرا بچپن کہیے یا لڑکپن ، عمر کے اس مرحلے میں ، صفحہ دل پر بے امیدی کی ایک تصویر سی جم گئی ۔ اس وقت مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا ۔ کیا امید تھی جو بر نہ آئی تھی اور کون سی صورت تھی جس کی آرزو تھی ، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس شعر کا بڑا اثر ہوا ۔ یہ شعر اکثر ورد زبان رہا کرتا ۔

---

۱ ۔ عرصہ ہوا میں نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا : ''غالب میرا دوست ۔ میرا رازدان''---، موجودہ یاد داشت میں اس مضمون کے کچھ حصے شامل ہیں ۔

مجھے اپریل کے وہ دن خوب یاد ہیں جب جبڑی ، (مانسہرہ میں چھوٹا سا چشمہ) کے کنارے بہار کے تازہ ترین جنگلی پھول سبزے سے ابھر ابھر کر مجھ سے ہم کلامی کرنے لگتے اور میں ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لیے اود گرد کی باہم ملتی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان ، پہروں فرش گیاہ پر بیٹھ کر ، بے امیدی کے نغمے شوق دل سے الاپا کرتا۔ اس وقت سب سے زیادہ یہی شعر ، ترجمان حال ہوا کرتا[1]۔

میرا مزاج یوں بھی مائل بہ یاس ہے مگر اس کچی عمر میں یہ نقش بے امیدی عجب انداز میں نقش پذیر ہوا۔ یوں اس کیفیت میں بھی ایک مزا ضرور تھا مگر تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر سے اب مجھے سقراط کی وہ نصیحت یاد آتی ہے جو افلاطون کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ سقراط نے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا :

”کیا ہم بے پروائی کے عالم میں اس امر کی اجازت دے سکتے ہیں کہ ہمارے بچے وہ حکایتیں سنیں اور پڑھیں جن سے ان پر وہ اثر ہو جو ہم نہیں چاہتے کہ ان پر بڑے ہو کر برا اثر ڈالے۔ ہرگز نہیں ! تو پھر

---

۱ - اسی زمانے میں ذوق کے یہ اشعار بھی پڑھے تھے :

آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ

صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

سب سے پہلے ہمیں افسانوی ادب پر احتساب قائم کرنا ہوگا۔

یہ سقراط کے الفاظ تھے جن کو تقریباً ہر ماہر تربیت نے اپنے اپنے زمانے میں دھرایا ہے اور میں کہتا ہوں کہ مناسب ہو گا کہ اس قسم کا احتساب شاعری کے نصابوں پر بھی قائم کیا جائے تاکہ بچپن ہی سے بچوں کے ذہن پر وہ نقش جم نہ جائیں جن کو بعد میں دور کرنا مشکل ہو جائے۔

بہر حال غالب سے میری پہلے علیک سلیک اس فضا میں ہوئی، اس کے بعد میں طویل مدت تک غالب سے بے خبر و بیگانہ رہا۔ اس عرصے میں مجھ پر کچھ اور قسم کے نشے غالب رہے، طالب علمی کے رنگا رنگ دور چلتے رہے اور ان کے ساتھ میرے ذوق کے رنگ بھی بدلتے رہے، ان میں سب سے زیادہ سیاست کا ذوق تھا۔ پھر جب سیاست کے ہنگامے خاموش ہو گئے اور قومی زندگی کے سب نشے ہرن ہو کر، رنج خمار میں بدل گئے تو میں نے اپنی تعلیم میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لی اور اس مرتبہ ایک ایسے شخص سے میرا تعارف ہوا جس کی شخصیت میں کمال علم کے باوجود قدرے آشفتگی بھی تھی۔ وہ میرا استاد بھی تھا[1] اور مربی بھی۔ اکثر شاموں

۱۔ اشارہ پروفیسر خواجہ محمد سلیم کی طرف ہے جو چند سال قبل تک پہلے گورنمنٹ کالج لاہور اور بعد میں اورینٹل کالج لاہور
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کو اس کے دیوان خانے میں میرے جیسے "شاگرد پیشہ" اور یار احباب جمع ہوتے اور فلسفہ و شعر اور ادب و فن کے متعلق گفتگوئیں ہوتیں ۔ پھر جب بھیڑ چھٹ جاتی تو یہ شخص پر درد لہجے میں غالب کے چیدہ اشعار گایا کرتا ۔ ان میں سے دو شعر آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں ــــ

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اسد بسمل ہے کس انداز کا ، کہتا ہے قاتل سے
تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

خواجہ محمد سلیم صاحب کے توسط سے "محاسن کلام غالب" (عبدالرحمٰن بجنوری) کا بھی پتہ چلا ــــ اس کے مطالعہ سے بڑی ذہنی کشادگی پیدا ہوئی !

غالب سے روشناسی کی یہ دوسری اہم تقریب تھی اور اتفاق سے اس مرتبہ پھر وہی بے امیدی بلکہ نا امیدی ۔

اس کے بعد دیوانِ شمس تبریز کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ نظیری کا مطالعہ پہلے کر چکا تھا مگر رومی کی غزلیات نے

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

میں انگریزی کے استاد تھے ۔ وہ مشرق اور مغربی ادبوں سے یکساں دل بستگی رکھتے ہیں ۔ فلسفہ ان کا خاص مضمون ہے مگر رموز ادب کے شناساے کامل ہیں ۔

کچھ اور ہی لطف دیا ۔ چنانچہ اس کے مطالعے سے غالب کی شاعری کا دامن پھر مجھ سے چھوٹ گیا اور میں رومی کی پرشور غزل میں محو ہو گیا ۔

۱۹۲۴ع میں مجھے خلاف معمول سردیوں کے موسم میں ہزارہ جانے کا اتفاق ہوا ۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور جاڑے کی طویل قہر آلود راتیں ۔ درد تنہائی نے کاٹنا شروع کیا :

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ایک دو کتابیں احتیاطاً ساتھ رکھ لی تھیں ۔ ان میں ایک سہا کی مطالب الغالب (شرح کلام غالب) تھی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا ۔ میں نے اس کو درد تنہائی کا درمان بنا لیا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر ، چراغ سفال کی روشنی میں، یہ ساری شرح پڑھ ڈالی ۔ اس سے میری نظر میں غالب کے متعلق کچھ وسعت پیدا ہوئی اور مجھے پہلی مرتبہ کلام غالب میں نا امیدی کے علاوہ کچھ اور مطالب بھی نظر آئے ۔ اس موقع پر میں نے حسن و محبت کے مضامین سے خاص دلچسپی لی ۔ ادھر (۱۹۲۵ع میں) ایم۔ اے فارسی میں غالب کے فارسی کلام کا جبری مطالعہ کرنا پڑا ۔ اس ذریعے سے میرے پہلے تأثر کا کچھ کچھ رنگ بدلا اور مجھے اس شاعر کی گہرائیوں اور وسعتوں تک پہنچنے کا ہلکا ہلکا خیال ستانے لگا ۔ لیکن یہ امر

واقعہ ہے ـــــ کہ فارسی کلام غالب کی جبری تدریس سے میں کچھ زیادہ متأثر نہ ہوا ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشعار کا ترجمہ انگریزی میں کیا جاتا تھا لہٰذا تشریح بقدر ذوق ممکن نہ تھی ۔

میں نے اپنے مطالعہ غالب کی یہ ابتدائی سرگزشت اس لیے لکھی ہے کہ یہ میری آئندہ کی سرگزشت کی تمہید بن سکے ۔ میرے مطالعہ کا یہ ابتدائی دور بڑی حد تک جذباتی مطالعہ کا دور تھا یعنی اپنے جذبوں کی تسکین کا دور ۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ابتدائی دور میں سیاسی تفکر مجھ پر غالب تھا اس لیے میں اردو کی قومی شاعری کو دوسری انواع شعر پر ترجیح دیتا تھا ۔ مگر جب قومی شاعروں کا رنگ پھیکا پڑا تو اردو میں حسرت اور فارسی میں نظیری نے اور ان سے بھی زیادہ حافظ و اقبال نے مصروف رکھا ۔ لیکن چونکہ میرے دل میں غالب نے اپنا مقام بنا لیا تھا اور وہ مقام آج تک اس کو حاصل ہے اس لیے گاہ گاہ میں دیوان غالب کی طرف بھی متوجہ ہوتا رہا ۔ میں مطالعۂ غالب کا تذکرہ کر کے اپنے لیے کسی انفرادی امتیاز یا یکتائی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں ۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ جس شخص نے زندگی میں غالب سے کبھی سروکار ہی نہیں رکھا وہ ازلی بے بہرہ بلکہ ناتراشیدہ اور بدذوق ہے ۔ غالب ان شاعروں میں سے ہیں جن سے تعلق رکھے بغیر

کوئی شخص نہ لکھا پڑھا ثابت ہو سکتا ہے ، نہ خوش ذوق ......اس وقت بڑا سوال یہ ہے کہ غالب نے مجھے کیا دیا اور وہ میرے لیے کس کس انداز میں باعث تسکین ثابت ہوا ۔ میں یہاں غالب سے اپنے تعلق کا اسی نقطہ نظر سے ذکر کر رہا ہوں ۔

مطالعہ غالب کی یہ کہانی چونکہ ذاتی اور شخصی ہے اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ زندگی میں میر نے مجھے جو الم دیا ، میں اکثر حالات میں اس کی تلافی دیوان غالب یا دیوان حافظ سے کرتا رہا ، اور ان دونوں کے یہاں سے مجھے نسخہ شفا مل بھی جاتا رہا ۔

یوں تو مطالعہ غالب میں ذوقِ راحت کی کئی صورتیں موجود ہیں ۔ معاملات محبت ، حسن و جمال محبوب کی دلفریب تصویریں ، ناز و ادا کے ظاہر اور چھپے ہوئے نکتے ، حقائقِ کائنات کے انکشافات ، طرزِ ادا کے اعجاز ، شوخیِ بیان کے کرشمے ، اور صنعت گری و تجمل کی شان . . . . ، یہ سب باتیں کلام غالب میں درجہ بدرجہ اور جا بجا جلوہ ریز ہیں مگر زندگی کے جذباتی یا ذہنی حوادث میں غالب سے جو رہنمائی مل سکتی ہے (اور مجھے ملی) وہ بذات خود ایک مستقل موضوع ہے ۔

۱۹۵۳ع کے اواخر میں مجھے یوں محسوس ہوا گویا

زندگی کی دھوپ پیلی پڑتی جا رہی ہے . . . . درختوں کے سائے اپنی اصلی قامت سے کچھ زیادہ ہی لمبے معلوم ہونے لگے ۔ کچھ یہ بھی احساس ہوا کہ زندگی کو کوئی جس نظر سے دیکھے (حکایت صبر گریزپا یا شکایت رنج گران نشین) ، حقیقت صرف یہ ہے کہ بے وفائی اس کی سرشت میں ہے ۔ اس خیال کے تحت اپنی ضعیف الاعتقادی کے باوجود میں نے اپنے لیے ایک فلسفہ مرتب کیا اور وہ یہ کہ صرف جمال حیات پر نظر رکھی جائے اور مقدر جو کچھ بھی عنایت کرے اس کو ارمغان ایزدی سمجھ لیا جائے . . . . یہاں تک کہ غم و الم کو ایک ہنگامہ زیست سمجھ کر خود اسے بھی سامان حیات بنا لیا جائے . . . . ، اس فضا میں غالب کے بعض اشعار سے بہت امداد ملتی رہی ۔ مثلاً

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

یا مثلاً یہ شعر :

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

بظاہر اس قسم کے اشعار میں افسردگی ہی کا ایک خاص رنگ ہے مگر یہ افسردگی دل کے بجھ جانے کے مترادف نہیں ، یہ تو اس حالت کا نام ہے جیسے یوں سمجھا جائے گویا راکھ

میں کچھ چنگاریاں ابھی سلگ رہی ہوں اور انہی سے دل کی انگیٹھی گرم گرم محسوس ہوتی ہو۔ غالب کے ذہنی کیفیات میں اس طرح کی حسرت بھی پر لطف ہے اور اسے آرزوئے زندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، مندرجہ بالا اشعار میں جو کیفیت ہے وہ حسرت سے زیادہ پراضطراب اور پر لطف ہے۔ اس رحجان کو ذہن غالب کا ایک خاصہ سمجھا جا سکتا ہے، یہ اس حالت میں بھی قائم رہتا ہے جب کہ ہاتھ میں جنبش بھی باقی نہیں رہتی اور دم صرف آنکھوں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

کلام غالب کے اس عنصر نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں نے غم کو کیمیا بنانے میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے اشعار سے طبیعت میں ہمواری اور دل میں سکون پیدا ہوتا رہا۔ مجھے یہاں یہ اعتراف کرنا ہے کہ جہاں میں نے کلام غالب کے اس حصے سے بہت فائدہ اٹھایا وہاں بعض دوسرے حصوں سے اتنا اثر نہیں لیا جتنا متوقع تھا۔ مثلاً زندگی کی بغایت شدید کیفیتوں والے اشعار سے میں اس لیے کم مستفید ہوا کہ اس معاملے میں میرا ذوق ان سے زیادہ میر سے تشفی پاتا ہے، اور میرا خیال یہ ہے کہ ایسے اشعار میں غالب نے میر ہی کے جواب میں ہیجانی کیفیت پیدا کر کے تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے یہاں جو دعوت انقلاب ہے ۔۔۔۔۔۔وہ اپنی جگہ خوب ہے مگر اقبال کے مطالعے کے بعد یہ دعوت بھی بے غایت معلوم ہوئی ۔ اور کہیں کہیں تو محض بلند بانگی کا احساس ہوا ۔ مثلاً غالب کی اس فارسی غزل میں کس قدر ادعا ہے (صرف مطلع درج ہے) ۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گران بگردانیم

اس غزل میں بڑی للکار اور پکار ہے مگر اس گھن گرج کے اندر دعوت انقلاب کی غایت کچھ بھی نہیں نکلتی خصوصاً جب کوئی یہ سوچتا ہے کہ یہ سارا ہنگامہ صرف ایک ''زن عشوہ گر'' کی ملاقات خلوت کے لیے تھا ۔ اس کے مقابلے میں حافظ کا وہ احتجاج کتنا قدرتی اور مؤثر نظر آتا ہے جو اس غزل میں بیان ہوا ہے جس کا مطلع یہ ہے :

این چہ شورے است کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

عین ممکن ہے کہ میری یہ رائے میری سوچ کے مختلف انداز کی وجہ سے ہو مگر میرا اندازہ یہ ہے کہ غالب نے زندگی کی بے غایت انقلابیت کو اپنا کر اپنے فطری میلان سے انحراف کیا ہے ۔ اس کے مقابلے میں ان کا وہ رویہ زیادہ نتیجہ خیز ہے جو زندگی میں مقاومت کا سبق سکھاتا ہے ۔ اگر مجھے اپنے

نقطہ نظر یا تاثر کے مطابق بات کرنے کی اجازت دے دی جائے تو میرے لیے غالب کا مندرجہ ذیل ایک شعر زندگی کی عظیم حکمتوں سے مالا مال ہے اور میں نے اپنی بے حاصل و بے نتیجہ زندگی میں اس کو اکثر مشعل راہ بنایا ہے۔ شعر یہ ہے:

تو نالی از خلہٴ خار و ننگری کہ سپہر
سر حسینِ علیؑ بر سناں بگرداند!

غالب کے یہاں نظام کائنات یا ''قاعدۂ آسماں'' کو بدل کر رکھ دینے کی جو پکار ہے اس سے میں متاثر نہیں ہوا، میرا انداز فکر مجھے ہمیشہ یہ سمجھاتا رہا کہ زندگی کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کی بنا مجبوری کے عنصر پر رکھی گئی ہے۔۔ آخر ''کج دار و مریز'' کا انکشاف یوں ہی تو نہیں ہوگیا تھا! ۔۔ اس جہان رنگ و بو کی عجیب عجیب ریتیں اور رسمیں ہیں۔ ان میں ایک مرحلہ یا کوئی مرحلہ ضرور آتا ہے جس میں شرافتوں کے تقاضے مسلک تسلیم پر مجبور کر دیتے ہیں۔ غلبہ اور یلغار کامیابیوں کا ایک اچھا ذریعہ ہے مگر کیا غلبے کی قاہری ہر صورت کے لیے موزوں ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں!۔۔۔ اگر نسل انسانی غلبے کی قاہری کے بجائے مقاومت محبت کے اصول پر عمل کرنا سیکھ لے تو ممکن ہے دنیا ایک معمورہ انس بن جائے۔۔۔ محبت کی یہ مقاومت بہت کم انسانوں کو میسر

آئی ہے ، ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں حسین ابن علی بھی ایک بڑا ، بہت بڑا انسان تھا جس کی جنگ شمشیر کی جنگ ہونے کے باوجود، محبت ہی کی جنگ تھی ۔ ۔ مگر محبت کی اس جنگ کا اولین اصول تھا : ہولناک شدائد میں بھی ماتھے کا سکون اور آنکھوں کا وقار قایم رکھنا ! ۔ ۔ ۔ غالب کا جو نقطہ نظر مندرجہ بالا شعر میں ظاہر ہوا ہے وہ ان کے ''جارحانہ اور حریفانہ کھینچیے'' کے اسلوب سے اونچا ، بہت اونچا ہے ۔ ۔ ۔ ! اور میں نے اپنے تفکر میں اس نقطۂ نظر کو بہت اونچی جگہ دے رکھی ہے !

ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ میں نے اپنی جذباتی کیفیتوں کے حوالے سے غالب کی غزل کو دیکھنا شروع کیا ۔ اور یہ بھی سمجھنا چاہا کہ بلند پایہ غزل گووں کی غزل میں مرکزی جذبوں اور ثانوی جذبوں کی باہم کیا نسبت ہوتی ہے ۔ اس طرز مطالعہ نے (کم از کم غالب کے سلسلے میں) مجھ پر یہ منکشف کیا کہ غزل کا مرکزی جذبہ ضروری نہیں کہ مطلع میں ، یا کسی پورے شعر میں ظاہر ہوا ہو ۔ غزل لکھنے والا، جذبے کی کسی تحریک سے، فوراً کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ اس مجبوری کے عالم میں ، کوئی مصرع یا کوئی شعر ۔ ۔ ۔ خصوصاً کوئی ایک مصرع سب سے پہلے ظہور میں آتا ہے، اور وہی غزل کا مرکزی مصرع یا شعر ہوتا ہے ، غزل کا باقی ڈھانچا بعد میں تیار ہوتا ہے اور اس مرکزی جذبے کے گوشت پوست کی حیثیت

رکھتا ہے۔ غالب کی اکثر غزلوں میں یہ مرکزی مصرع تلاش کیا جاسکتا ہے۔ غالب کی وہ غزل جس کی ردیف ہے، صلا میرے بعد، ۔ ۔ ۔ ناز و ادا میرے بعد وغیرہ۔ اس تجزیے کی بہترین مثال ہے، اس میں، میری دانست میں مرکزی مصرعہ ہے:

بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد ۔ واللہ اعلم

بہرحال میں نے بڑی محنت سے اس قسم کا تجزیہ کیا اور ان نتائج کو اپنے ایک مضمون "غالب کی غزل" میں جمع کیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ نتیجے کہاں تک صحیح ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اسی زمانے میں مجھے کلام غالب کی صحیح جذباتی کیفیتوں کا کچھ علم ہوا۔

غالب کے اردو کلام کا مطالعہ اپنی جذباتی کیفیتوں کے حوالے سے یوں بھی مفید ہوا کہ غالب کی ہر غزل کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کم از کم میرے لیے ممکن ہوگیا کہ کوئی خاص غزل، عمر کے کس دور کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوا کہ غالب کی اردو غزلیں، مختلف ادوار عمر کی ترجمان ہیں۔ ہر غزل میں یا زمانۂ شباب کے یا زمانہ زوال شباب کے یا خوف پیری کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ ان میں عشق و محبت کے وہ مضامین بھی ہیں جو کسی منزل عمر سے خاص نہیں بلکہ رسمی ہیں۔ بھرپور جوانی کی

نمائندگی کرنے والی غزلیں الگ الگ کی جا سکتی ہیں ۔ اور زوال شباب کی الگ ، (اور ان کی تعداد زیادہ ہے) ۔ (میرا یہ فیصلہ ذاتی ہے ۔ ممکن ہے کسی اور طالب علم کو اس آئینے میں کچھ اور نظر آتا ہو) ۔ اسی لیے کسی نے کہا تھا کہ غالب زوال شباب کے احساسات کا شاعر تھا ۔

تدریسی ضرورتوں نے بھی غالب پر غور و فکر کا موقعہ دیا ۔ اگر مدرس ہو کر اچھا تنقیدی شعور بھی قائم رہے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے ، میں نہیں کہ سکتا کہ میں اس شعور کو قائم رکھ سکا یا نہیں ، مگر میری یہ آرزو رہی ہے کہ مجھے معارف غالب کی بصیرت حاصل ہو جائے ۔ اس لیے اکثر غور و فکر سے مطالعہ کرتا رہا ہوں (میں نے کئی برس ادیب فاضل جماعت کو دیوان غالب پڑھایا اور میرا خیال ہے کہ میں بات پیدا کرنے میں کام یاب ہو جاتا رہا) ۔ اور میرا خیال ہے کہ میں بعض موقعوں پر کچھ نئی چمک پا لینے میں کامیاب بھی ہوا ہوں ۔

یہ بحث بہت طویل ہے اور ایک مستقل مضمون کی طلب گار ہے ۔ یہاں میں ایک دو باتوں کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں جن کا تعلق شرح اشعار سے ہے ۔

غالب کا احساس کمال اور ان کی خود نگری ایک مسلم واقعہ ہے ۔ اس احساس نے ان کے کلام میں طرح طرح کے

اثرات چھوڑے ہیں ۔ ان کا رشک اس کا ایک اہم پہلو ہے ۔ مگر اس کی ایک دلچسپ صورت دنیائے کمال کی نامور شخصیات کے متعلق غالب کا ذہنی رویہ ہے ۔ اپنے احساس کمال کے معاملے میں غالب کا شعور اتنا منفرد تھا کہ وہ ناموری کے انتساب میں اپنے علاوہ کسی اور کی شرکت کو غیرشعوری طور پر بھی پسند نہیں کرتے ، یہ صحیح کہ اس میں ان کی طرف سے عدم احترام کا کوئی شائبہ نہیں مگر تشکیک ضرور ہے ۔ ان کا یہ رویہ غیر شعوری ہے اور اس میں وہ مجبور و معذور ہیں مطلب یہ کہ جذباتی اور روحانی دنیا کے جو مسلم ہیرو ہیں غالب ان کو ہیرو مانتے تو ہیں مگر کوئی نہ کوئی پیرایہ ایسا ضرور اختیار کر جاتے ہیں جس سے ان ناموروں کی شہرت و ناموری میں تشکیک یا تردید کا پہلو نکل آتا ہے ۔

یہ خاص بات غالب کے اہم نفسی خصائص میں منجملہ کلیدی امور کے ہے چنانچہ اس کو مدنظر رکھ کر ان کے متعدد اشعار کی شرح آسان ہو جاتی ہے جو شارحین کے یہاں الجھ سی گئی ہے ۔

غالب کا ایک شعر ہے :

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

عام خیال کے مطابق شعر کا پہلا مصرع محض خبر یا محض

بیان ہے ۔ شارحین کہتے ہیں : غالب کے نزدیک "جز قیس اور کوئی بھی" عشق کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا کیوں کہ صحرائے عشق چشم حاسد کے مانند تنگ تھا اور اس میں کسی کا گزر ممکن نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ ان میں ایک قیس تھا جس سے یہ ہو سکا ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی قیس کو اس معاملے میں یکتائی حاصل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ !

مگر غالب کے عام رویے کی روشنی میں یہ شرح صحیح نہیں ۔ میرے نزدیک شعر کا مصرع اول طنزیہ تعجب کا حامل ہے اور اس میں اس عام خیال کی تشکیک بلکہ تضحیک ہے کہ قیس ہی عشق کی دنیا کا واحد ہیرو تھا اور عاشقی کی ریت اس پر ختم ہو گئی ۔ غالب کی رائے میں یہ خیال مضحکہ خیز ہے کہ عشق کے ممکنات کو اتنا محدود سمجھ لیا جائے کہ اس کو قیس کے تجربات تک منحصر کرلیا جائے ۔ عشق کے تو ہزاروں ممکنات ہیں اور ان میں قیس کے علاوہ اور بھی بے شمار نامور پیدا ہو سکتے ہیں یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ قیس کے بعد عاشقی کی دنیا سنسان ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ یہاں تو ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں! غالب وسعت طلب اور نصب العینی شاعر تھا اس لیے وہ ممکنات کو ماضی میں محدود رکھنے کے حق میں نہیں ہو سکتا ۔

بہرحال اس ایک شعر کی روشنی میں غالب کے کئی

دوسرے اشعار کی شرح کی جا سکتی ہے اور اس طرح ان کے ایک اہم نفسیاتی رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر اسی انداز میں ذیل کے چند اشعار کی تشریح کی جائے تو معانی کا رخ ہی بدل جائے گا۔

مانع وحشت خرامی ہائے لیلی کون ہے ؟
خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاودان کے لیے

خود نگری کی یہ نفسیاتی صورت ایک حد تک میر تقی میر نے بھی اختیار کی ہے مگر انھوں نے کوہکن و مجنوں کے متعلق قدرے مصالحت کا رویہ اختیار کیا ہے۔۔۔ اور انھیں ”عزت داروں“ میں شمار کر کے ان کے کمال میں کچھ زیادہ

رخنے نہیں نکالے البتہ مسیح و خضر سے ضرور الجھے ہیں ۔ غالب کا رویہ معروف انسانوی شخصیتوں کے متعلق بالکل مختلف ہے ۔

میں نے غالب کے تدریسی مطالعے کے دوران اس طرح کے کچھ اور کلیدی نکتے بھی دریافت کیے ہیں ۔ مگر اس مختصر یاد داشت میں ان کا احاطہ ممکن نہیں ۔ ان میں سے اہم نکتہ یہ ہے کہ کلام غالب کو مغل تہذیب کے سماجی و ادبی احوال کی روشنی میں پڑھنا چاہیے ۔ اس طریق مطالعہ سے ، حقائق غالب کا وسیع تر انکشاف ممکن ہے ۔

ایک قابل توجہ امر یہ ہے کہ کلام غالب کو فنون لطیفہ کے حوالے سے دیکھا جائے ، یہ کام عبدالرحمٰن چغتائی نے کیا ہے ۔ مگر غالب کے فنی امکانات اس سے وسیع تر ہیں ۔ غالب کو مغل دور کے جملہ فنون لطیفہ کی روشنی میں پڑھنے کی ضرورت ہے ۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ غالب کی ساری شاعری کو باہم ملا کر پڑھا جائے اور اردو اور فارسی کی شاعری کے اتفاقات اور اختلافات کی شرح لکھی جائے ۔ اب تک (جہاں تک مجھے معلوم ہے) یہ کام بہت کم ہوا ہے ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے افکار غالب میں اور شیخ محمد اکرام نے غالب سے متعلق اپنی کتابوں میں کچھ کام کیا ہے اور پروفیسر شیرانی بھی اس نظر سے غالب کو دیکھنا چاہتے تھے مگر عمر نے

وفا نہ کی ۔ ان کے کتب خانے سے دیوان غالب کا ایک نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں منتقل ہوا ہے ، اس کے حواشی سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس طرز مطالعہ سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے مگر ان سے تکمیل نہ ہو سکی ، اب یہ ادبی فرض کسی اور کو انجام دینا چاہیے ، عموماً غالب کو فارسی کے شاعر اور اردو کے شاعر کے طور پر الگ الگ دیکھاجاتا ہے۔ انھیں مکمل شاعر کے طور پر دیکھنے کی رسم ابھی عام نہیں ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے ان کی ادبی شخصیت دو حصوں میں بٹ جاتی ہے اور اس تقسیم سے غالب کا نقصان بھی ہے اور ان کے ساتھ نا انصافی بھی ، چونکہ غالب کا ذہن اور ان کی ادبی صلاحیت دونوں زبانوں میں محفوظ ہے اس لیے صحیح طرز مطالعہ یہی ہے کہ دونوں دواوین کو یکجا دیکھا جائے۔ مماثل اشعارکو جمع کیا جائے اور مختلف المضمون اشعار کا بھی تجزیہ کیا جائے ، اس طرح زبان کے فرق کے باوجود غالب کی مکمل شاعری کو مرتب انداز میں پیش کیا جاسکے گا ، میں نے اس سلسلے میں کچھ کام کیا ہے ، مگر اس وسیع کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فرصت کی ضرورت تھی ، وہ مجھے نہیں ملی ۔ ۔ ۔ ۔ بہر صورت آرزو تھی اور ہے کہ غالب کو اس طرح بھی دیکھ سکوں ۔

یہ ہے غالب سے میری نیاز مندی کی کہانی ۔ میں چاہتا

تو اس کو پھیلا کر کتاب بنا دیتا ۔ مگر میں مختصر کہانی کو ناول پر ترجیح دیتا ہوں ، ممکن ہے کوئی دوسرے صاحب اس داستان کو اپنے عمیق تر مطالعے سے اور زیادہ پھیلا دیں ۔

میں نے اپنی طرف سے آشنائی کا تھوڑا سا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے جسے میں مدۃالعمر کی آشنائی کہہ سکتا ہوں ! شاید اس بہانے غالب شناسوں کی فہرست میں میرا نام بھی کسی ذیلی حاشیے میں درج ہو جائے !

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا شبلی نے ایک خط میں عطیہ بیگم فیضی کو لکھا ہے کہ اگر تم کسی زبان اور اُس کے ادب کا ذوق پیدا کرنا چاہتی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کے ہلکے پھلکے اور آسان شعر بار بار پڑھیں۔ یہاں تک کہ تمھیں اُس میں لطف آنے لگے۔ مثلاً مرزا داغ کا یہ شعر:

بات کرنی تک نہ آتی تھی تمھیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

مولانا نے جو کچھ فرمایا بالکل بجا فرمایا اور درست مشورہ دیا۔ لیکن میں اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ کسی شعر کے بار بار پڑھنے سے صرف اُس کی زبان کا ذوق ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اگر اُس میں کوئی حقیقت یا اخلاقی، روحانی اور نظریاتی قدر بیان کی گئی ہے تو وہ بھی دل و دماغ میں رچ بس جاتی ہے اور اُس سے سیرت و کردار کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ میں محسوس کرتا ہوں کہ مرزا غالب کے بعض اشعار کا میری طبیعت اور مزاج پر غیر معمولی اثر ہوا ہے اور

انھوں نے زندگی کے بعض پہلوؤں سے متعلق میرے فکر و نظر کو ایک خاص آہنگ و رنگ بخشا ہے ۔

اگر ہر بڑے شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ، تو کلام غالب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ غالب کے مزاج میں قلندری ، وابستگی اور بے نیازی کامل درجہ کی تھی ۔ خدا پر اُن کا اعتقاد پختہ تھا ۔ خدا کے ساتھ غایت تعلق اور اس پر کامل بھروسہ اور اعتماد کے باعث ان میں خودداری اور عزتِ نفس کا احساس اس درجہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے ۔ چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔ ان میں شاعر کے اس کردار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں :

دل ہر قطرہ ہے ساز اناالبحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا ۔ برا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے ، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے مرا یہ جام سفال اچھا ہے

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یہ صرف چند اشعار بطور نمونہ کے پیش کیے گئے ہیں۔ ورنہ غالب کا اردو اور فارسی کلام اس قسم کے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے مرزا کے ساتھ عقیدت اور ارادت بچپن سے رہی ہے اور میں ان کا کلام اپنی زندگی کے اس دور سے گنگنا گنگنا اور مزے لے کر پڑھتا آیا ہوں جب کہ میں کلام کے معنی و مطلب اور اس کی خوبی و بلندی کو پورے طور پر سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مندرجۂ بالا اشعار اور ان کے ہم معنی اور شعر خاص طور پر وردِ زبان رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری طبیعت میں بھی توکل علی اللہ اور ارباب دنیا کی طرف سے استغنا اور بے نیازی کا مادہ پیدا ہو گیا اور میں نے دیکھا ہے کہ قدرت نے ہر موقع پر میری اس خاص افتاد طبع کی لاج بھی رکھی ہے۔ واقعات تو اور بھی ہیں لیکن میں یہاں مزید گنجائش نہ ہونے کے باعث صرف دو واقعے بیان کروں گا:

پہلا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں عربی میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد میں نے الہ آباد یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں الگ الگ لکچرر کی ایک پوسٹ کے لیے درخواست بھیجی تھی۔

لیکن اس کا حشر یہ ہوا کہ ناکامی ہوئی اور جن اسباب کے تحت ناکامی ہوئی تھی اس کا طبیعت پر بہت برا اثر ہوا - میں نے خدا کا نام لے کر عہد کر لیا کہ اب میں کبھی کسی پوسٹ کے لیے درخواست نہ دوں گا - خدا کی شان ہے کہ میں اب تک اس عہد پر قائم ہوں - اس درمیان میں سینٹ اسٹیفنسن کالج دہلی میں لکچرار رہا - دلی یونیورسٹی میں پہلے عربی میں ریڈر اور پھر صدر شعبۂ عربی ، فارسی اور اردو بنا - کلکتہ مدرسہ کلکتہ کا پرنسپل مقرر ہوا اور اب آج کل علی گڑھ میں ہوں - یہ سب جگہیں پیش کش سے ملی تھیں اور کہیں درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہوئی - اس سلسلے میں میرا سینٹ اسٹیفنس کالج میں جو تقرر ہوا ہے اس کا واقعہ بہت عجیب اور شنیدنی ہے - ہوا یہ کہ ۱۹۳۹ع اور ۱۹۴۰ع میں میں نے عارضی طور پر چھ چھ ماہ کے لیے لکچرار کی حیثیت سے کام کیا تھا - لیکن جب ۱۹۴۰ع کے آخر میں اس پوسٹ کا اعلان نکلا تو میں نے اس کے لیے درخواست نہیں دی - نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صاحب کا جو پنجاب سے تعلق رکھتے تھے تقرر ہوگیا - جب ایک برس پورا ہو گیا اور اب ان صاحب کے تقرر کا وقت آیا تو کالج کے پرنسپل مسٹر این - کے - سین نے ڈاکٹر سید اظہر علی صدر شعبہ سے موصوف کے کام کے بارے میں رپورٹ طلب کی -

رپورٹ اچھی نہیں تھی - اس بنا پر موصوف کو ایک برس کے بعد جواب دے دیا گیا اور اب پوسٹ پھر یعنی ۱۹۴۲ع میں مشتہر ہوئی - حالانکہ یہ زمانہ میرے لیے معاشی مشکلات کا تھا - لیکن بعض دوستوں اور بزرگوں کے شدید اصرار کے باوجود اس مرتبہ بھی میں نے درخواست نہیں دی اور اس کا جو انجام ہونا تھا وہ ہوا - امیدواروں کا انٹرویو ہوا اور ایک صاحب جو ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - تھے اُن کا انتخاب بھی ہو گیا - لیکن جب پرنسپل صاحب تقرر نامہ ڈرافٹ کرنے کے لیے بیٹھے تو اُنھوں نے چپراسی بھیج کر ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب کو بلایا اور جب وہ آ گئے تو اُن سے بولے "ڈاکٹر صاحب ! اس امیدوار کا تقرر حسب قائدہ ابھی ایک سال کے لیے آزمائشی (Probationary) ہوگا نا !" ڈاکٹر صاحب نے کہا "جی ہاں ! قائدہ تو یہی ہے" "لیکن اگر ان کا کام بھی اطمینان بخش نہ ہوا تو پھر" پرانسپل صاحب بولے "تو انھیں الگ کر کے پوسٹ پھر مشتہر کیجیے گا" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا - "اس طرح تو ڈاکٹر صاحب ! ہمارا کالج بدنام ہو جائے گا - لوگ کہیں گے انھیں ڈھنگ کا آدمی ملتا ہی نہیں ہے - پوسٹ ہر برس مشتہر ہوتی ہے" پرنسپل صاحب نے ہمک کر فرمایا - اب ڈاکٹر صاحب نے یہ سنا تو بولے "جناب ! میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر

کہتا ہوں کہ اگر آپ کو ایک ایسا شخص درکار ہے، جو ایم - اے - اور آنرز کی کلاسوں کو ہر پرچہ تسلی بخش طریقہ پر پڑھا دے اور پھر وہ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں اعلیٰ قابلیت رکھتا ہو تو وہ سعید احمد اکبر آبادی ہے - آپ اسے بلا لیجیے" پرنسپل صاحب یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے "اچھا تو پھر ان کو ہی بلائیے - لیکن آپ خود جائیے اور انھیں لے کر آئیے-" چنانچہ نومبر ۱۹۴۲ع کی ایک صبح تھی کہ ڈاکٹر صاحب میرے مکان پر آئے اور پرنسپل صاحب کا پیغام پہنچایا - میں نے اسے قبول کر لیا - کالج پہنچا تو پرنسپل صاحب نے مختصر شفقت آمیز گفتگو کے بعد تقرر نامہ میرے حوالے کیا -

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر ۱۹۴۸ع کے اواخر میں حکومت مغربی بنگال نے مجھ کو پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ کی پیش کش کی - میں نے اسے قبول کر کے ۲ فروری ۱۹۴۹ع کو اس کا چارج لے لیا - دو برس بعد جب میں نے حکومت کو استقلال کے لیے لکھا تو حکومت نے ایک خاص دفعہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ جب تک بنگالی زبان کا مقررہ امتحان پاس نہیں کر لوں گا میں مستقل نہیں ہو سکوں گا اور واقعہ ہے بھی یہی - دوسرے کالجوں میں لوگ پندرہ پندرہ بیس برس سے پڑے تھے اور

محض اس شرط کو پورا نہ کرنے کے باعث مستقل نہیں ہو سکے تھے - لیکن میں نے انجام سے بے پروا ہوکر گورنمنٹ کو صاف لکھ دیا کہ یہ امتحان پاس کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے - اس لیے گورنمنٹ کو چاہیے مجھ کو اس شرط سے مستثنلی قرار دے کر مجھے مستقل (Confirmed) کر دے ورنہ میرے اس خط کو استعفا سمجھا جائے - بزرگوں اور دوستوں کو میرے اس خط کی اطلاع ہوئی تو وہ سخت مایوس اور رنجیدہ ہوئے - انھیں یقین تھا کہ استثنلی نہیں ہو گا اور مجھے الگ ہونا ہوگا - میں بہرحال اپنی جگہ مطمئن تھا کہ ''مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں'' اس سلسلہ میں گورنمنٹ سے کافی خط و کتابت اور زبانی بات چیت بھی رہی لیکن میں اپنی بات پر جما رہا - آخر کلکتہ کے تمام کالجوں میں حیرت و استعجاب کی لہر دوڑ گئی - جب گزٹ میں گورنمنٹ کا یہ آرڈر شائع ہوا کہ ''سعید احمد اکبر آبادی کو بالکل خصوصی طور پر بنگلہ کے امتحان سے مستثنلی قرار دے کر پرنسپل کلکتہ مقرر کیا جاتا ہے اور یہ استثنلی کسی کے لیے نظیر نہ ہوگا''

اس میں شبہ نہیں کہ طبیعت کی اس افتاد میں مذہب کی تعلیمات ایک خاص ماحول میں تربیت اور اردو و فارسی کے دوسرے شعرا خصوصاً علامہ اقبال کے کلام کا بھی بڑا دخل

ہے - لیکن میں غالب کو اس زمانہ سے پڑھتا رہا ہوں جب کہ میں قرآن و حدیث سے بھی آشنا نہیں تھا اور اقبال کے کلام کو سمجھ نہیں سکتا تھا - اس بنا پر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غالب کے اشعار جو سراسر زندگی کے حقائق کے ترجمان ہیں ان کا بھی زندگی سے اور اس کے مسائل سے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر کے متعین کرنے میں بڑی حد تک دخل ہے - آج بھی اگر کوئی پریشانی ہوتی یا غم سے سابقہ پڑتا ہے اور میں غالب کا یہ شعر :

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

پڑھتا ہوں تو سکون سا ہو جاتا ہے -

اسی طرح کبھی کشمکش حیات کی کوئی الجھن سر پر سوار ہوئی اور کسی معاملہ کا صرف ایک رخ سامنے ہونے کی وجہ سے دلگرفتگی محسوس ہوتی ہے تو مندرجہ ذیل شعر سے دل کی یہ گرہ کھل جاتی ہے :

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بہر حال حزن و الم ، محرومی و ناکامی ، طلب و جستجو اور امید و بیم کی کوئی کیفیت ہو - غالب کے اشعار سے آج بھی حوصلہ اور ولولہ ملتا ہے - اسی لیے غالب کا

کلام مجلس احباب میں صرف گرمی پیدا کرنے کا سامان نہیں
بلکہ وہ مصاف ہستی میں ایک بانگ درا بھی ہے اور روشنی
کا مینار بھی !

میرے ذہن میں غالب کی کوئی معین تصویر نہیں جس کے متعلق میں یہ کہہ سکوں کہ غالب کے فقط اس روپ نے مجھے متاثر کیا ہے۔ مجھے غالب نے عمر کے مختلف ادوار میں اور مخصوص معاشرتی اور نفسیاتی حالات میں مختلف طور پر متاثر کیا ہے۔ اس کی تصویر کے رنگ، شائبے، سایے، اور پس منظر اور پیش منظر ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔ میں اس قسم کا متوکل انسان ہوں جس نے بارہا شکست کھانے اور تسلیم کرنے کے باوجود ذہنی طور پر شکست آمادگی کو نہیں اپنایا اور اللہ کے بھروسے پر نیک نیتی سے اپنے مقاصد حیات کی پیشرفت پر اصرار کیا ہے، لیکن قنوطیت پسند نہ ہونے کے باوجود اُن مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ جہاں کبھی کبھی تھک ہار کر غالب کی یہ بات پسند آئی ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہدف و مقصود کی کمیابی اور نایابی کے دوران کبھی

کبھی آرزو مندی اور تساہل کی یہ کیفیت بھی طاری ہوئی ہے:

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کے زمانے میں حسین مناظر کو دیکھ کر غالب کی منظر نگاری اکثر یاد آتی ہے:

بیا کہ فصل بہارست و گل بہ صحن چمن
کشادہ روی تر از شاہدان بازار ست

اور پھر غور و فکر کی دنیا جب بھی آباد ہوئی ہے عزم و عمل کی کشمکش کا سلسلہ چلا ہے تو:

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

کہہ کر ذہن نے غالب کے اس فلسفے کو اپنایا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب!
ہم نے بزم امکاں کو ایک نقش پا پایا

علمی ماحول میں اپنی بے بضاعتی کے ساتھ کام کرتے ہوئے جب جیالے غالب کو اپنی تالیف "قاطع برہان" کی مدافعت میں "تیغ دو دستی" سے جہاد کرتے دیکھا ہے تو اپنے مطعون ہونے کے زمانے میں غالب کی یاد سے بڑی تسکین اور راحت محسوس ہوئی ہے:

نہ سرو برگ ستایش ، نہ دماغ نفریں

"سیاست کلام" اگر کوئی علم ہے تو غالب کی اس تلقین نے ہمیشہ راہنمائی کی ہے :

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات آس نے شکایت ضرور کی

غرض غالب "صد رنگ" اور "ہزار شیوہ" نے ہمیشہ مجھ سے یہ کہلوایا ہے :

جوہر ہر ذرہ ، از خاکم ، شہید شیوہ ایست
وای من ، کز خود شمار کشتگانش کردہ ام

(غالب)

سید وقار عظیم

غالب سے میری ذہنی وابستگی اور جذباتی شیفتگی کا آغاز کب اور کیونکر ہوا ؟ یہ سوال شعوری طور پر میرے سامنے ، آج سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور آج سے پہلے یادوں کے ان بے شمار چراغوں نے جو آج جھلملاتے ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں ، اس چراغاں کی صورت اختیار نہیں کی تھی جو اس وقت میرے سینے میں روشن ہے -

پہلی یاد اب سے کوئی ۴۵ سال پہلے کی ہے - میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا - اردو کی جو کتاب داخلِ نصاب تھی ، اس کے حصہ نظم میں میر ، درد ، غالب اور حالی کی دو دو تین غزلیں ، مثنویوں میں میر حسن اور نسیم کی مثنویوں کے علاوہ غالب کی مثنوی ''آموں کی تعریف میں'' کا ایک ٹکڑا شامل تھا جو اس شعر سے شروع ہوتا تھا :

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے

حصہ نثر میں سرسید ، آزاد ، شبلی ، نذیر احمد اور شرر کی تصانیف کے اقتباسات کے علاوہ غالب کے تین چار خط بھی تھے۔

غالب کی جن تین غزلوں کے منتخب شعر شامل نصاب تھے ، ان کے پہلے مصرعے یہ ہیں :

۱ - کوئی امید بر نہیں آتی

۲ - ابن مریم ہوا کرے کوئی

۳ - نہ تھا کچھ توخدا تھا، کچھ نہ ہوتا توخدا ہوتا -

امتحان سے کچھ دن پہلے جب نصاب ختم ہوا تو مجھے اپنے ادب کے کئی اکابر کے نام یاد ہو چکے تھے لیکن جو نام سب سے زیادہ یاد تھا وہ غالب کا تھا - اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بغیر کسی کوشش کے غالب کے کئی شعر زبانی یاد ہو گئے تھے ، دوسری وجہ آموں کی تعریف میں کہے ہوئے وہ شعر جنھیں پڑھتے وقت ان طرح طرح کے آموں کا ذائقہ تازہ ہوتا رہتا تھا، جن کا گہوارہ اودھ کی وہ سر زمین ہے جو باغ جنت کے لیے بھی باعث صد رشک ہے - نثاروں اور شاعروں کے ان بڑے بڑے ناموں میں سے صرف غالب کے نام کا میرے ذہن کی گہرائیوں میں جگہ بنا لینے کی ایک وجہ غالب کی آموں سے گہری رغبت کے وہ لطیفے تھے جو ہمارے اردو کے مولوی صاحب نے ”بارے آموں کا کچھ بیان ہوجائے“

پڑھاتے وقت ہماری ہنسی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمیں سناتے تھے ۔ آٹھویں جماعت کے نصاب کے خاتمے کے بعد جو غالب مجھے کوئی واضح احساس دلائے بغیر چپکے سے میری شناسائی اور آشنائی کے حلقے میں داخل ہو گیا تھا ، وہ ایک شاعر تھا جس کے کچھ شعر مجھے زبانی یاد تھے اور کچھ مولوی صاحب کی انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آئے تھے ، وہ ایسا شاعر تھا جس نے آموں کی تعریف میں بڑے خوبصورت شعر کہہ کر میری پسند کے پھل کو اپنی پسند کا پھل کہا تھا ، وہ ایسا انسان تھا جو آم حاصل کرنے کے لیے بادشاہوں تک سے ہنسی مذاق کی باتیں کر سکتا تھا ۔

اس کے بعد کے دو تین برسوں میں بڑی تیزی سے کئی باتیں ہوئیں اور غالب کا ملا جلا شاعرانہ اور انسانی وجود میرے ذہنی وجود میں سے نکل کر میرے جذباتی وجود میں سماتا رہا ۔ گھر میں ، پاس پڑوس میں اور چھوٹی بڑی تقریبوں میں بجنے والے گراموفون ریکارڈ دل نشین دھنوں میں غالب کی غزلیں سنا سنا کر اس احساس میں یقین کا رنگ بھرتے رہے کہ غالب ہمارے گردو پیش کی ساری زندگی میں سمایا ہوا ہے ۔

ایف ۔ اے میں داخلہ ہوا اور قدم اناو کی چھوٹی سی بستی سے نکل کر لکھنؤ کی طرف بڑھے جو سارے ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا دل تھا ۔ تدریس شروع ہوئی اور

اُستادوں نے ادب اور زندگی کے باہمی ربط کی طرف اشارے کیے اور ادب و شعر کی پرکھ کی کسوٹیاں سامنے رکھیں اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ سب باتیں تو غالب نے مجھے پہلے سے سکھا رکھی ہیں۔ آٹھویں جماعت میں پڑھے ہوئے کسی شعر کے اچھا لگنے اور کسی شعر کے معنی سمجھ میں نہ آنے کی جو یاد اب بھی تازہ تھی اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ شعر کو جانچنے کے جو معیار تمھیں اب شعوری طور پر بتائے جا رہے ہیں وہ غالب کی غزلوں کے طفیل غیر شعوری طور پر تم نے پہلے سے اپنا رکھے ہیں۔ شاعر کے شعر کا اپنی ذات کے ساتھ اور اپنے معاشرے کی ذات کے ساتھ جو گہرا تعلق ہے اس کی منطق، غالب کے خطوں، اس کے لطیفوں اور اس کی کوچہ و بام میں گائے جانے اور خاص و عام کے دل میں اتر جانے والی غزلوں کے وسیلے سے تم تک پہنچ چکی ہے۔ غالب کے رشتے میرے قلب و ذہن کو اسیر کر لینے والی یہ پوشیدہ، غیر محسوس اور غیر شِعوری منطق ایف۔ اے اور بی۔ اے کی چار سال کی تعلیم کے دوران میں میرے لیے محسوس اور شعوری بنتی گئی۔ حامد اللہ افسر، مولوی محمد حسین اور سید مسعود حسین رضوی جیسے استادوں کی ادبی اور شعری بصیرت، ان کی تصانیف جو غالب کے اشعار کی تشریح و تفسیر و تعبیر کو ادب کے دقیق مسائل

کا وسیلہ بناتی تھیں ، مرزا محمد عسکری کی ادبی خطوط غالب ، بے خود موہانی اور آسی لکھنوی اور اثر لکھنوی جیسے شارحین غالب کے خیالات پر بحثوں کی گرم بازاری ، نگار کے خاص نمبر ، غالب کی زمینوں میں کہی جانے والی طرحی غزلوں کے مشاعرے ، چار پانچ سال تک لکھنو میں رہ کر مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہماری شاعری میں غالب ہی سب کچھ ہے اور اس کا دیوان غزلیات ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے خارجی اور داخلی تجربوں کا عطر ہے۔

یہی زمانہ ہے جب مضامین رشید پڑھے اور اندازہ ہوا کہ اس عظیم مزاح نگار اور طنز نگار کی عظمت میں غالب کا فیضیان اثر کس حد تک کارفرما ہے - یہی دور ہے جب علی عباس حسینی ، ل ۔ احمد اکبر آبادی ، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھ پوری کے افسانوں نے ادب کی اس مقبول صنف کو عروج بخشا تھا۔ لیکن ان کے افسانوں کے عنوان دیکھ کر ان کے افسانوں میں آنے والے مکالمے پڑھ کر اور ان کے اسالیب کی خوش ترکیبوں پر نظر ڈال کر یہ رائے اور زیادہ پختہ ہو گئی اور اب دیوان غالب میرے لیے حرز جان بن گیا ۔

ایم - اے کے نصاب میں غالب کی غزلیں بھی تھیں اور ان کے خط بھی۔ اب غالب کو اور قریب سے دیکھا اور میری تنقید نگاری کی ابتدا جن دو مضمونوں سے ہوئی وہ دونوں

غالب کے زیر بار احسان ہیں ۔ ایک مضمون تھا ”شعر میں سادگی“ اور دوسرا ”اردو کا پہلا نقاد“ ۔ پہلے مضمون کے خیالات کا سر چشمہ غالب کے شعر تھے اور دوسرے کی بنیاد تنقید کے وہ اصولی نکتے جو اردو نثر میں سب سے پہلے غالب کے خطوں کے وسیلے سے ہم تک پہنچے ہیں ۔

غالب مجھے سب شاعروں اور سب نثاروں سے زیادہ عزیز ہے کہ مجھ میں جو تھوڑا بہت تنقیدی شعور ہے وہ اسی کا عطا کیا ہوا ہے ۔ اتفاقات اور حادثات نے غالب کو مجھ سے چھین لیا ۔ کس سے کہوں کہ یہ غم میری زندگی کا کتنا بڑا غم ہے ؟

ن - م - راشد

پروفیسر بخاری مرحوم کی نظر سے مشہور افسانہ نگار محمد حسن صاحب عسکری کے بعض ''تنقیدی'' مضامین گزرے۔ بے ساختہ پکار اٹھے - ''یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عسکری صاحب ان فرانسیسی ادیبوں کے ساتھ رات بھر تاش کھیلتے رہے ہوں !''

آپ نے غالب کے بارے میں ''ذاتی اور انفرادی'' تاثرات پر مضمون کا مطالبہ کیا ہے اور میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں یہ مضمون بھی غالب کے ساتھ بے جا بے تکلفی ہو کر نہ رہ جائے - تاہم آپ نے اچھا کیا کہ ایک ہزار الفاظ کی قید لگا دی - شاید اسی بہانے قلم سے کوئی کام کی بات نکل جائے !

غالب سے اس نیاز مند کا تعارف اس وقت ہوا جب میں نویں جماعت میں تعلیم پانے کی کوشش کر رہا تھا - (آج کل کے طالب علم تو اس سے بھی بہت پہلے غالب حفظ کر لیتے ہیں !) ایک ہم جماعت جن کے ساتھ روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا غالب کے اشعار کا دن رات ورد کرتے رہتے تھے - انہی کو حیرت میں

ڈالنے کے لیے خود بھی غالب کے بیسیوں اشعار یاد کر ڈالے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ میں اب تک غالب کو محض ''ناظرے'' ہی پڑھ سکتا تھا۔ (آج کل کے طالب علم شاید بچپن ہی سے غالب کے مطالب کی گہرائیوں تک جا پہنچتے ہوں!)۔ بہر حال جان کاہی اور جان کنی کا وقت تب آیا جب گورنمنٹ کالج لاہور میں مولوی کریم بخش صاحب مرحوم کے سامنے غالب کو سمجھنے کے لیے مجبوراً زانوے تلمذ تہہ کرنا پڑا۔ مولوی صاحب اردو کے جید عالم مشہور تھے۔ لیکن—یا شاید اسی وجہ سے—وہ شاعری اور شاعروں کے نہایت مخلص دشمنوں میں سے تھے۔ اور بیچارے غالب سے تو انھیں خاص طور پر چڑ تھی۔ مولوی صاحب صرف طوعاً و کرہاً غالب پڑھاتے تھے۔ جب کہیں غالب کا کوئی ''نہایت عاشقانہ شعر'' آ جاتا تو کچھ شرما جاتے۔ کچھ بوکھلا اٹھتے اور آخر کتاب پھینک گھر کی راہ لیتے اور ہم ان کے لطف و عنایت کے ان لمحوں کو غنیمت شمار کرتے۔ کبھی ہم میں سے کوئی کسی شعر کا مطلب پوچھنے کے لیے ان کا پیچھا کرتا تو ہاتھ جھٹک کر کہتے "چلو جاؤ۔ مجھ سے یہ لغو شاعری نہیں پڑھائی جاتی''۔ لہٰذا ہمیں اپنی تربیت کی صورت نکالنی پڑی۔ غالب کی تمام شرحیں خریدیں اور ایک ایک کر کے پڑھ ڈالیں۔ خدا بھلا کرے نظامی بدایونی کی شرح،

حسرت موہانی کی ، سہا خیر آبادی کی ، بے خود کی ، آسی لکھنوی کی ۔ اب غالب کچھ کچھ پلے پڑنے لگا ۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ شرحیں بھی محض وہ کثرت تعبیر کیوں ہیں جو اس خواب پریشان کو پریشان تر کر رہی ہیں ؟

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب !
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

شارح کی زبان میں :

"شاعر کہتا ہے ، کہ اے میری تمنا ۔ یعنی جانِ تمنا ۔ یعنی محبوبہ جب یہ دشت امکان یعنی ربع مسکون یعنی دنیا تیرا ایک ہی قدم یعنی پائوں ہے تو"

معلوم ہوا کہ غالب کو شعر کہنا نہیں آتا تھا ! بہت دنوں تک کسی شرح کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں پڑی ۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے عزیز دوست ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے صرف "بانگ درا" کی شرح لکھنے پر اکتفا کی ہے ۔ جب بجنوری ہاتھ لگا ، (مرحوم نے دو تین نظمیں کیسی پیاری لکھی تھیں !) تو آنکھیں روشن ہو گئیں ۔ مشرق و مغرب کا یہ علم اور کہاں ملے گا ؟ نثر میں یہ قصیدہ خوانی کسے نصیب ہوئی ہو گی ؟ سخن فہمی کے بہانے اتنا عشق کسی شاعر سے کس نے کیا ہو گا ؟ جب ڈاکٹر لطیف کی انگریزی کتاب "غالب" ملی ، تو اندازہ ہوا کہ ایبر کرومبی

نے جو عظیم شاعری کی تعریف کی تھی - اس پر بیچارہ غالب
پورا نہیں اترا اور افسوس ہوا کہ ایبر کرومبی صاحب غالب
سے پہلے دلی میں کیوں نہیں پیدا ہوئے؟ بہر حال ایسا بھی
کیا شاعر جو مغربی شاعروں سے اتنا گھٹیا ہو - (ایک ہی
حیدر آباد سے دو متضاد آوازیں بلند ہوئیں تھیں!) اسی زمانے
کے لگ بھگ نیاز فتحپوری لکھ رہے تھے کہ غالب کی چوریاں
پکڑی گئی ہیں اور یادش بخیر مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے تو
غالب کو اکھاڑے میں اترنے کی دعوت دے رکھی تھی -
سوچا - غالب عظیم شاعر ہو یا نہ ہو - چور شاعر ہو یا نہ ہو
اور مرزا یاس یگانہ کے مقابلے میں جم سکے یا نہ جم سکے -
لیکن یہ کیا مصیبت ہے کہ ہر جگہ یوم غالب منائے جا رہے
ہیں - لوگ اس کی شرحوں پر شرحیں لکھ رہے ہیں - مصور اس
کے شعروں کی تصویریں بنا رہے ہیں - کالج کی اعلٰی جماعتوں
میں مولوی کریم بخش صاحب کے باوجود غالب پڑھایا
جا رہا ہے - لوگوں کو اس کے سینکڑوں شعر از بر ہیں - یہ
سوچتا تھا کہ الہام ہوا - "اردو ادبیات پر غالب کے اثرات"
پر تحقیق کرنی چاہیے - جب یہ مضمون مکمل ہوا تو یوم
غالب پر پڑھا گیا، سر عبدالقادر کی صدارت میں اور "ادبی
دنیا" میں چھپا - اس پر اپنی عمر میں سب سے پہلا معاوضہ
ملا - پورے پانچ روپے! غالب کی قدر دل میں بڑھ گئی -

یہ مضمون آج طفلانہ معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن خاصا طویل تھا ۔ ''ادبی دنیا'' کے پرانے سائز کے دس بارہ صفحے ۔ پھر اختر شیرانی کے ہاں سے غالب کے فارسی کے کلیات کا ایک پرانا نسخہ چرا کر پڑھا ۔ حتیٰ کہ چوری پکڑی گئی اور سال واپس کرنا پڑا ۔ لیکن اسے پڑھ کر پتہ چلا کہ غالب کا اردو کلام جو خود اسے پسند نہ تھا ۔ اور فارسی کلام میں جو تازگی ہے وہ آدمی کو زندہ کر دیتی ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح عشق نے خود غالب کو نکما کر دیا تھا اور ''نظم و نثر مولانا ظہوری' نے خود غالب کو زندہ کر رکھا تھا ۔ غالب کے خطوط اسی زمانے میں پڑھے ۔ بلکہ اُن کا وہ لطف آیا کہ اُن کی پیروڈی لکھ کر ''راوی'' میں شائع کی ۔ (بے چارے شوکت تھانوی کو یہ حسرت رہی کہ غالب کے خطوط کی پیروڈی کا خیال انھیں جلد تر کیوں نہیں سوجھا !) اس کے باوجود ''مہر نیم روز'' اور ''دستنبو'' کے مطالعے سے خدا نے آج تک محفوظ رکھا ہے ۔ کیوں کہ ان کتابوں کو پڑھنا غالب کو اپنا ہم پیشہ نہیں بلکہ ''عمر بھر کا پیشہ'' بنانا ہے ۔ پھر اکثر اُس عشق پر حیرت ہوتی ہے جو غالب کو مولانا ظہوری اور مرزا بیدل سے تھا ۔ لیکن اس پر کبھی رقابت محسوس نہیں ہوئی ۔ غالب کی روح کو خوش کرنے کے لیے ان دونوں بزرگوں کا کلام بھی پڑھا ہے ۔ لیکن ان کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے ۔ وہ گورنمنٹ کالج میں

نصیب نہ ہو سکا ۔ شاید اب حالات رو بصحت ہوں ۔

اگر شیخ محمد اکرام صاحب اور شیخ غلام رسول صاحب مہر کی تالیفات کے علاوہ غالب پر کوئی کام کی کتاب مل جائے تو اس کا اتا پتا ضرور بتائیے گا اور عبداللہ انور بیگ صاحب سے ملاقات ہو تو بعد سلام عرض کیجیے گا کہ غالب کے انگریزی ترجمے بہت ہو چکے ۔ اب کرم فرمائیے ! اور انتظار کیجیے کہ "فوری چاولوں" کے موجد مرحوم عطا اللہ خان اوزئی کے ترکے کی خطیر رقم سے امریکہ میں کس قسم کا ترجمہ ایجاد ہوتا ہے !

میں سوچتا ہوں کہ اگر اردو شاعری کو غالب نصیب نہ ہوتا تو خود میرے شعر و فن پر کتنا بڑا المیہ گزر جاتا - میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں معتقدات کی پرواز ، زیادہ سے زیادہ تصوف کی ایک نہایت محدود دنیا تک ممکن تھی - بچے میں وہ جو کرید اور جستجو کا جذبہ ہوتا ہے ، وہ ایسے ماحوّل میں اول تو دب کر مر جاتا ہے ، اور اگر اپنی شدت کی برکت سے زندہ رہتا بھی ہے تو اپنا تخلیقی رخ بدل لیتا ہے - اس عالم میں جب میرے ذہن میں "آخر کیوں ؟ اور آخر کیسے ؟" کے سے تخلیقی سوالات شرک اور کفر کے خوف سے دبنے لگے تھے اور میں مابعد الطبیعیاتی تاویلوں میں اپنی تلاش و جستجو کے لیے پناہ گاہیں تراشنے لگا تھا ، غالب سے محض اتفاقاً میرا تعارف ہوا اور میرا تخلیقی وجود ، جس پر شکست و انفعال کا غبار جمنے لگا تھا ، ایک پھریری لے کر تازہ دم ہو گیا - ''تفسیر حقانی'' کے درس کے دوران مجھے سمجھایا جا رہا تھا کہ انسانی عقل کا مقدر نارسائی ہے اور کائنات کی حقیقت اولیٰ کا ادراک نا ممکن ہے - انسانی عقل کی رسائی

کی آخری منزل حیرت ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ :

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اور پری چہرہ لوگوں اور زلف عنبریں کے شکنوں والے شعروں کو گول کر کے فوراً بعد یہ شعر پڑھا گیا :

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے

درس ختم ہوا تو میں نے سوچا کہ واقعی یہ سب کیا ہے؟ اس کے ساتھ ہی دینی معتقدات اور مروجہ حالات کے درمیان مجھے بعض ایسے تضادات نظر آئے جن کی نوعیت سطحی تھی مگر جن کے ادراک نے ایک حساس بچے کو بے چین کر دیا ۔ یہ شاید ۱۹۲۹ء ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے ۔ چنانچہ میں نے دیوان غالب حاصل کیا اور اگرچہ بہت کم اشعار کے مفہوم تک مجھے رسائی حاصل ہوئی مگر جو اشعار میری سمجھ میں آ گئے انھوں نے مجھے ایک نہایت لذیذ ، ہیجان سے آشنا کیا ۔ غالب سے متاثر ہونے کی یہ بنیاد اتنی گہری اور مضبوط ثابت ہوئی کہ آج بھی جب میں ولی سے لے کر آج تک کے اردو شعراء پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو غالب ، چراغوں کی ان قطاروں میں مجھے فانوس کی طرح جگمگاتا نظر آتا ہے ۔

غالب یوں تو بے حد متنوع اور تہ دار شاعر ہے اور

اس کے ہاں تجربوں کی اتنی فراوانی ہے کہ اس کی کسی ایک ہی خصوصیت سے متاثر ہو کر رہ جانے کو میں بدذوقی قرار دیتا ہوں ، البتہ غالب کی دیگر متعدد خصوصیات کے علاوہ جس خصوصیت نے میرے فکر و فن کو نمایاں طور پر متاثر کیا ہے ، وہ اس کی تعقل پسندی ہے - محض تعقل پسندی نہیں بلکہ ایک شاعر کی ، ایک حسن کار کی ، ایک فن آفرین کی تعقل پسندی ـــــ غالب کی اس خصوصیت نے اردو شاعری کو مجہول ہونے سے بچا لیا ہے -

غالب کا دور سیاسی ، تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے ہیجان و خلفشار کا دور تھا - پرانی قدریں مٹ رہی تھیں اور نئی قدروں کی صورت پذیری میں دیر تھی - ماضی کے عظیم الشان ایوان ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھ گئے تھے اور حال متلاطم اور مستقبل دھندلا تھا - بالکل وہی صورت حال تھی جس کا ذکر ہمارا آج کا ادیب کرتا ہے مگر وہ اس عصری بدنظمی کے حوالے سے شعر و فن میں بھی بدنظمی کا حق مانگتا ہے - غالب کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف تھا - اس نے خارجی دنیا کی بدنظمی سے نمٹنے کے لیے اپنی تخلیقی شخصیت میں داخلی نظم پیدا کیا اور یوں مجہولیت کے ان عصری تقاضوں کے سامنے سپر انداز نہ ہوا جن کے دباؤ کے تحت غالب کے بیشتر معاصرین نے ہتھیار ڈال دینے ہی میں عافیت سمجھی

اور شاعری کے سے گرہ کشا فن کو مداری کا کھیل بنا ڈالا ۔ یوں سمجھیے کہ غالب نے شاعری میں سے ادراک و دانش کو بن باس نہیں دیا بلکہ ادراک و دانش اور تجربہ و مشاہدہ کی بھٹی میں جذبہ و احساس کو تپا کر شعری تخلیق کو نئی معنویت بخشی ۔ اسی تعقل پسندی نے غالب کی شاعری میں ندرت و جودت پیدا کی اور اسے اس تنوع اور بوقلمونی سے آراستہ کیا کہ اردو کا کوئی بھی شاعر غالب کے ہمہ گیر اضطراب ، اس کے تجربوں کی وسعت اور اس کی حیرت انگیز نکتہ آفرینی کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ غالب میں جو بے چینی ہے ، جو جستجو ہے ، حقیقت مطلق تک پہنچنے کی لگن کی جو شدت ہے ، وہ اسی تعقل پسندی کی دین ہے ۔ غالب کو اپنے تجربوں کے اظہار کا بے پناہ حوصلہ بھی اسی لیے حاصل ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسی وجہ سے وہ خارج کے تلاطم کے سامنے امید کے چراغ کو بجھنے نہیں دیتا ۔ جن تہذیبی قدروں نے اس کی شخصیت مرتب کی تھی ، ان کا زوال اسے یقیناً رلا رلا دیتا ہے مگر وہ اس قیامت میں بھی اپنی شخصیت کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیتا ۔ یہ اسی داخلی نظم کی برکت ہے جو تعقل پسندی ہی سے ممکن ہے ۔

غالب کا مطالعہ اس کے عصر کے پس منظر میں کیجیے تو وہ اس حد تک جدید ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا ، اسے اس انتہا

تک جدید ہونے کا حوصلہ ہی کیسے ہوا جب کہ اسے اسی عصر میں زندہ رہنا تھا ۔ مثبت انداز میں جدید وہی ہوتا ہے جو ماضی (اور حال) سے عدم اطمینان کا اظہار کرتا ہے مگر ماضی و حال سے رو گردانی کا نتیجہ صرف ایک صورت میں ظاہر نہیں ہوتا ۔ اس کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک رو گردانی کلبیت پر منتج ہوتی ہے اور اردو شاعروں کی جدیدتر نسل کے بعض افراد کا طرز فکر اس کی ایک مثال ہے ۔ لایعنیت اور بے معنویت کے فلسفے اسی کلبیت سے پیدا ہوتے ہیں ۔ دوسری رو گردانی کا نتیجہ اس کھوج ، اس کرید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس بیابان شب کی کوئی انتہا بھی تو ہوگی ۔ نہیں سے اس تلاش و جستجو کا آغاز ہوتا ہے جو غالب کی شاعری میں جاری و ساری ہے ۔ غالب ماضی کی قدروں کے زوال پر افسردہ ضرور ہے مگر اس بات کا بھی اسے یقین ہے کہ اب ماضی کو زندہ کرنا ممکن نہیں اور انسانی ارتقاء کا قافلہ مستقبل کی طرف گامزن ہے ۔ اگر غالب کو اس حقیقت کا ادراک نہ ہوتا تو زندگی بھر بیدل کے تتبع میں کون سی برائی تھی اور اسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ :

اثر آبلہ سے ، جادۂ صحرائے جنوں
صورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

غالب کی عظمت اس میں ہے کہ وہ تعقل پسند ہونے

کے باوجود شاعر ہے ، فلسفی یا مفکر نہیں ہے ۔ انسان اور اس کی زندگی ، زمین اور کائنات ، حسن اور خدا کے بارے میں وہ کسی منضبط فکری لائحہ عمل کے مطابق غور نہیں کرتا کہ یہ طریق کار فلسفیوں کا ہے ، شاعروں کا نہیں ۔ یوں سمجھیے کہ غالب کے ہاں ایک فکری شان ہے یا ایک فکری مزاج ہے اور وہ اس فکر کا اظہار انتہائی حسن کاری اور شاعری کے جمالی تقاضوں کے مکمل احترام کے ساتھ کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی میں وہی شاعر آج بھی بڑے شاعر ہیں اور ہمیشہ بڑے شاعر رہیں گے جو فکر اور جذبے کی ایک متوازن اور باہمی مربوط صورت کو پیش کرتے ہیں ۔ غالب بھی اسی لیے بڑا ہے کہ وہ مسلسل سوچتا ہے مگر شاعر کی حیثیت سے سوچتا ہے ۔ وہ کسی تجربے یا مشاہدے کے تاثر کو اپنی پوری شخصیت میں سے گزار کر اس کا اظہار کرتا ہے ۔ وہ غوطہ لگاتے ہی ڈوب نہیں جاتا بلکہ نئی معنویتوں کے موتیوں سے مٹھیاں بھر کر ابھرتا ہے ۔ وہ اتنا باشعور ، اتنا "خبر دار" شاعر ہے کہ حقیقت مطلق کے سوا وہ کسی چیز کو مطلق نہیں سمجھتا بلکہ مسلسل تغیر—ارتقائی تغیر پر اس کا ایمان ہے ۔ اقبال کا ایک شعر ہے جو اس کے منفرد رنگ کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے :

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

اسی خیال کو غالب غزل کی سی داخلی اور موضوعی صنف سخن میں یوں ادا کرتا ہے :

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہی وہ مقام ہے جہاں فکر و فن اور حسن و حقیقت کی یک جائی ، شعر سننے والے کے صرف دل یا صرف دماغ کو متاثر نہیں کرتی بلکہ اس کی پوری شخصیت میں جھنجھناہٹ سی پیدا کر دیتی ہے جیسے شعر نے اس کے ہر بنِ مو کو ساز کی طرح چھیڑ دیا ہے ۔ غالب کی شاعری میں فکر و فن کے اسی معجزانہ امتزاج نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ۔

اختر حسین رائے پوری

کم عمری میں میں بھی اردو غزل کی خوبیوں سے منکر تھا۔ میرا ادبی مزاج ایسی کسی تحریر کو پسند نہ کرتا تھا جس میں کوئی کام کی بات نہ ہو۔ وقت کے ساتھ یہ نظریہ بدلتا گیا۔ جو تہذیبی ورثہ ہم تک پہنچا تھا، تغزل اس کا واضح عنصر تھا اور اس کی تخلیق میں صدیوں کا خون جگر شامل تھا۔ کیا در اصل وہ کذب و افترا کا یہی دفتر تھا جس کا ماتم مولانا حالی نے کیا اور کیا اس کی حیثیت فارسی غزل سرائی کے کرم خوردہ چربہ سے زیادہ نہ تھی؟

اس تعصب کے طلسم کو میر اور غالب نے ختم کیا۔ اگر عشقیہ شاعری میں نشاط کی کیفیت کو حافظ سے بہتر کسی نے بیان نہیں کیا تو درد ہجر کو میر سے بہتر کسی نے رقم نہیں کیا۔ بہر صورت زندگی نہ سراسر نشاط ہے نہ سراسر غم۔ غالب کے یہاں ان دونوں کیفیتوں کا سنگم ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں سوچنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اسے ایک ایسا انداز بیان عطا کیا جو انفعال و شکست کی روایتی سرگوشی سے قطعاً علیحدہ تھا۔ نثر میں انھوں نے میر امن

کے اسلوب کو اس طرح زندہ کیا کہ وہ آنے والے نثر نگاروں کے لیے چراغ راہ بن گیا۔

غالب کی شخصیت کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ انھیں مرد نشاہ ثانیہ RENAISSANCE MAN کہا جائے۔ مراد اس ذات سے ہے جس کی نگاہ میں ماضی و مستقبل دونوں کے جاوے ہوں اور جو اپنے کو تلاش و تجسس کے لیے وقف کر دے۔ غالب کے اجداد کا پیشہ سپہہ گری ہوا کرے لیکن وہ مانیں نہ مانیں ان کا پیشہ شاعری تھا۔ تلاش معاش میں انھیں بڑی ذلت اٹھانا پڑی اور پنشن کی تلاش میں وہ اتنے ہی پریشان ہوئے جتنے اس زمانے کے سرکاری ملازم سرگرداں ہوتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ اس بد بختی نے ان کے جوہر اصل کو آنچ نہ لگنے دیا۔ جب وہ کسی انگریز حاکم یا دیسی رئیس کی قصیدہ خوانی سے تھک چکتے تو ان کے کانوں میں آواز غیب آتی اور وہ ماحول پر لاحول پڑھتے ہوئے کہہ اٹھتے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے\
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اردو ادب میں یہ ایک نئی آواز تھی۔ اب تک کسی نے اس بلندی پر چڑھنے کا قصد نہ کیا تھا۔ یہ جرأت رندانہ، غالب جیسا آزادہ رو اور آزاد مزاج ہی کر سکتا تھا۔ جب وہ اس بلندی پر پہنچے تو انھوں نے انسانیت کے کمال کو

پا لیا اور ان کی نظر میں مذہب و ملت کی تمیز باقی نہ رہی۔ اس انداز فکر کی تاب جب آج لوگ نہیں لاتے تو اس زمانہ میں کیسے لے آتے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی و دہری

سوال یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ جلا کہاں سے آئی؟ اس میں شک نہیں کہ وہ طبعاً مفکر تھے۔ لیکن جو علمی سرمایہ ان کے اردگرد تھا وہ اس رجحان کی پرورش کے لیے کافی نہ تھا۔ یہ ان کی نظر بینی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے بیدل جیسے خیال آفرین استاد کو اپنا مرشد بنایا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ دلی کالج کے اساتذہ کی صحبت نے انھیں نئے علوم کے خطوط سے آشنا کیا۔ اس طرح ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا۔

آج سے سو سال پہلے میرزا غالب نے تاریخ کے جس دوراہے پر اس دنیا کو خیر باد کہا اس پر برصغیر اپنی پستی کی تہہ کو چھوکر اوپر ابھرنے کی آرزو کرنے لگا تھا۔ اس افق پر ان کی شخصیت اس روشنی کی طرح تھی جو طلوع مہر سے پہلے آسمان پر پھیل جاتی ہے۔ جاتے وقت وہ اردو نثر و نظم کو اس نکتہ پر چھوڑ گئے جہاں تقلید کے دروازہ بند اور اجتہاد کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔

اُردو کے کسی شاعر نے 'کیوں' اور 'کیا' کا اتنا استعمال نہیں کیا جتنا غالب نے۔ وہ حیرت و استعجاب سے اس کائنات کے اسرار پر غور کرتے تھے اور زیر لب یہ بھی پوچھتے تھے کہ ان کے معاشرے کے در و دیوار کیوں گر پڑے۔ ان میں سے جو سوال ابدی ہیں ان کا جواب کسے معلوم۔ لیکن جن سوالوں کا تعلق معاشرے کی تخریب و تعمیر سے ہے آنے والی نسلوں نے انھیں دوہرایا اور ان کے جواب اپنے طریقے سے تلاش کیے۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

شیخ منظور الٰہی

احباب کی محفل میں موضوع زیر بحث یہ تھا کہ وقت دبے قدموں یوں گزر جاتا ہے کہ احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان یک لخت خوابِ گراں سے چونکتا ہے۔ اوہ! فلاں کام تو کر ہی نہ پائے۔ کتنے ہی ارادے تشنۂ تکمیل رہ گئے۔ ہمتوں کی پستی، شوق کی بلندی پہ غالب آکے رہی۔

اے ز فرصت بے خبر درہرچہ باشی زود باش

اس پہ ایک دوست نے مرزا غالب کا یہ شعر پڑھا:

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

تو میں پھڑک اٹھا۔ یہ شعر پڑھا تو ہوگا۔ مگر حافظے میں محفوظ نہ تھا۔ یوں بھی اس غزل کا زبان زد عام شعر تو یہ ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس شعر میں بھی رموز و اسرار کا خزینہ پنہاں ہے ۔ فکر و شعور اِنگڑائیاں لے رہے ہیں ۔ لیکن فوت فرصت ہستی ، کتنی اچھوتی ترکیب ہے اور فوت فرصت ہستی کا غم کس قدر صداقت پر مبنی ! فوت فرصت ہستی کا غم مٹے تو کیونکر ۔ جو کل تھا ۔ آج نہیں جو آج ہے کل ہو یا نہ ہو ۔ انیس و ہمدم ایک ایک کرکے اٹھ جاتے ہیں ۔ حریفان بادہ پیما ، منتشر ہو جاتے ہیں ۔ اور انسان تنہا رہ جاتا ہے ۔

حالات بدل جاتے ہیں ۔ انسان بدل جاتا ہے ۔ بمرور ایام ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے ۔ وقت کا دھارا دھیرے دھیرے ان دیکھے اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔ طبع میں جولانی نہیں رہتی ۔ عنفوان شباب میں ہرحیلے ، ہر موقع ، ہر تقریب سے حظ اٹھانے کی سعی ، عزائم میں ستارے چھو لینے کی تمنا ، کچھ بھی تو باقی نہیں رہتا ۔

گذشتہ سال مجھے اس شعر کی صداقت کا احساس شدت سے ہوا ۔ جیسے کسی نے گہری نیند سے جھنجھوڑ کے کہا ہو ۔ ”آج ہمارا محبوب پاکستان بیس برس کا ہو چکا ۔“

بیس برس ! عمر رواں کا ایک گراں قدر حصہ ۔ عمر گذراں کا ایک طویل وقفہ !

ذہنوں کے درمیان رشتۂ بلوغت ، نسلوں کے درمیان حد فاصل !

بیس برس میں ہم نے کیا کھویا کیا پایا ؟ جواب بن نہ پایا - مگر ذہن بھی بخش دینے پر راضی نہ تھا - وطن عزیز کے لیے کیا کیا ؟ اپنے شہر کے لیے ؟ اپنے لوگوں کے لیے ؟ ان لوگوں کے لیے ، جن کی جد و جہد کے بغیر پاکستان کا حصول ممکن نہ تھا -

ہم اوائل شباب میں نیک مقاصد اور ارفع آدرش کی زاد راہ لے کے نکلے تھے - لیکن آج بھی منزل کوسوں دور تھی - اپنی کم مائیگی ، در ماندگی اور بے بضاعتی کا احساس شدید تر ہو گیا - جو وقت عمل میں صرف ہوتا تھا - وہ کج بحثی اور فقرے چست کرنے کی نذر ہو گیا - ہم میں سے بیشتر نیک تمناؤں کے اظہار پر اکتفا کر لیتے ہیں - یا کمر ہمت باندھنے میں اتنا وقت صرف کر دیتے ہیں کہ "جنگ" ختم ہو چکی ہے - ایسے میں آپ ہی کہیں کہ فوت فرصت ہستی کا غم کیونکر نہ ہو -

اس سے قطع نظر کہ فوت فرصت ہستی کا غم کیوں تھا - گزرے ہوئے لمحات کا غم ایک حقیقت ہے - جس سے انحراف نہیں ہو سکتا - خواہ وہ ارفع مقاصد نہ پا سکنے کی حسرت ہی کیوں نہ ہو -

دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو

جن کی رفعت سے مجھے اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے - اور وہ ازلی کشمکش ! ایمان مجھے روکے ہے۔ تو کھینچے ہے مجھے کفر - انسان فرشتہ تو نہیں -

"نا کردہ گناہوں کی حسرت" بھی کبھی دل پر شنجوں مارتی تھی - تصور گناہ - اور اس کے ساتھ مسلسل نبردآزمائی میں جو لطف تھا ، وہ شاید ارتکابِ گناہ میں بھی نہ ہوتا - مانا کہ وہ تصور دیر پا نہ تھا - ہوا کا جھونکا ، سطح آب پر لطیف نقش بنائے یا طوفانی تھپیڑا سینۂ دریا تہہ و بالا کر ڈالے، بالآخر نقش برآب ہے اور گزشتنی - ہم نے سوچا تھا کہ اس کا اثر پائندہ نہیں - اس بحر ظلام سے یوں ابھرتے تھے جیسے کبھی ڈوبے ہی نہ تھے - جیسے گناہ کے اندھیارے نے زندگی کے اجالوں کو چھوا تک نہیں - ہمارے زعم میں ہماری معصومیت برقرار رہی - (یہ خود فریبی تھی) - ہمیں جرأتِ گناہ پر تعجب بھی ہوا تھا - احساس گناہ کے بے پناہ ریلے ہمیں دبوچتے تھے - اور ہم پر کاہ کی طرح اس مد و جزر کے ساتھ ابھرتے ڈوبتے تھے - نا کردہ گناہ !

ایک رطل گراں ، ایک عظیم عشق ، ایک لمحۂ عالیہ پا لینے کی حسرت !

وہ دن بھی گزر گئے - ان لمحوں کو آواز دینا چاہیں گے تو صدا گلوگیر ہو کے رہ جائے گی -

فروری ۱۹۶۸ء میں والد ہم سے جدا ہو گئے۔

میں اس سوچ میں پڑگیا کہ اس شعر کا اطلاق والد مرحوم کی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے بھرپور زندگی بسر کی۔ نا امیدی اور قنوطیت کا لفظ ان کی لغت میں نہ تھا۔ انھوں نے کبھی ہار نہ مانی تھی کوئی لمحہ فراغت کا نہ ہوتا۔ تعلیمی سماجی اور قومی اداروں میں ان کا انہماک دیدنی تھا اور قابل رشک! ہر حال میں انھیں حاجت مندوں کی دل جوئی منظور تھی۔ ان کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہ جاتا۔ کسی کو تعارفی خط دے دیا۔ کسی کے لیے فون کر دیا۔ کبھی کسی اجنبی کے ساتھ خود چل کھڑے ہوئے تاکہ اس کی حق رسی ہو جائے۔ کہتے ہیں خلق خدا کی خدمت عبادت ہے۔ لیکن ان کا باقی وقت بھی ذکر و عبادت میں گذرتا۔

انھیں اس بات کا احساس تھا کہ انھوں نے بھرپور زندگی بسر کی ہے۔ جوانی میں شکار اور گھوڑے کی سواری، دوستوں کی محفلیں، شخصیتوں اور خاندانوں سے تعلقات، وہ برس ہا برس پنجاب یونیورسٹی، زراعتی یونیورسٹی، پنجاب اسمبلی اور مغربی پاکستان اسمبلی سے منسلک رہے۔ متعدد رفاہی اداروں سے متعلق ہونے کے علاوہ انجمن اسلامیہ لائل پور کی سربراہی انھیں ۱۹۳۵ء میں تفویض ہوئی اور دم آخر تک رہی۔ ایک مثالی زندگی جو ہر لحاظ سے بنی نوع انسان

کے لیے کار آمد تھی -

انھوں نے انتقال سے چند ماہ پیشتر کہا تھا کہ اب کوئی حسرت باقی نہیں رہی ، اس کے باوجود جد و جہد سے مملو زندگی گزر جانے کا ملال انھیں بھی تھا - سانس پورے ہو چکے تھے - وقت کی ریگِ رواں شیشۂ ساعت سے قریباً گزر چکی تھی - چند ذرے باقی تھے جن میں آب و تاب اب تک قائم تھی - وہ جسے زندگی سے والہانہ شغف تھا ، وہ جس کی زندگی ”حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز“ کی تفسیر تھی ، آخری دنوں میں گرتی ہوئی صحت کے سبب زندگی میں ان کی دلچسپی کم ہونے لگی تھی - جیسے دہرا رہے ہوں -

مٹتا ہے فوتِ فرصت ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

الطاف گوہر

غالب کی شخصیت اور کلام سے میں نے کیا پایا ؟

وہ کیا "نیا تصور یا نیا احساس" کیا "نیا فکری یا جذباتی افق" تھا جو غالب کے واسطے سے میرے لیے منور یا منکشف ہوا ؟

غالب نے (میری) ذہنی فکری اور جذباتی زندگی کو کس عنوان سے متاثر کیا اس سے (میں نے) کیا پایا اور ذاتی طور پر (میرے لیے) وہ کیا معنی رکھتا ہے"؟

غالب جیسے شاعر اور غالبؔ جیسی شخصیت کے سلسلے میں غالباً یہ مشکل ترین سوالات ہیں ۔ غالب کے کسی طالب علم ، کسی پرستار ، کسی ریسرچ اسکالر اور نقاد کو آج تک یہ ہفت خواں طے کرنے کو نہیں کہا گیا ہوگا ۔

لفظ و معنی ایک نیرنگ تمنا ہیں ۔ میں عمر کا ایک بڑا حصہ اس نیرنگ تمنا کا تماشائی بھی رہا ، اس کا اسیر بھی ۔ اس پر مشرق و مغرب کے معانی سازوں نے بہت کچھ لکھا ۔ میں نے بہت کچھ پڑھا اور شعر تو نہیں نثر میں اس موضوع پر

اپنی جستجو کی کئی بار داستان لکھی ۔ ان نکتوں اور گوشوں کی داستان یا بیان جو اس بحث نے مجھ پر منکشف کیے ---

سنتے ہیں شروع میں ایک "خیال" تھا جو صوت اور حرف کی منزلوں سے گزرا تو ایک لفظ بنا ۔ اس سے کیا ظاہر کیا باطن ، پیدا و پنہاں ، ورا اور ماورا سب کچھ وجود میں آیا ۔ جب سے اب تک یہ بحث جاری ہے کہ نیرنگ تمنا کی ترجمانی لفظ کرتا ہے تو لفظ کیا ہے ۔ پھر فہم اور ادراک اور عرفان جیسے انسانی کمالات ہیں ۔ اختراع ، ایجاد اور انکشاف جیسے انسانی اعزاز ہیں ۔ اور ان سب کا سہارا اور ترجمان بھی لفظ ہے ۔

تو لفظ کی پہنائی ، اس پہلے لفظ "کن" سے لے کر اب تک صدیوں کے انسانی کمالات پر محیط ہونے کی موجودہ منزل تک کیا ہوگی ۔

میں نے رسمی طالب علمی کے دور میں جب غالب سے نیرنگ تمنا اور جوہرِ اندیشہ جیسے لفظ سنے تھے تو لفظ کی اس قوت سے بے جانے بوجھے بہت ہیبت زدہ ہوا تھا ۔ پھر مختلف عالمگیر واقعات ، مختلف عالمگیر تحریکوں ، مختلف عالمگیر انقلابات میں لفظ کی قوت دیکھی تو ہر دفعہ یہ خیال آتا رہا کہ ان قوتوں کی بے پایاں آگ سے لفظ مرتا کیوں نہیں ، مٹ کیوں نہیں جاتا ، جب کہ غالب کہتا ہے کہ جوہرِ اندیشہ کی گرمی سے --- یہ آبگینہ پگھل جاتا ہے ۔

مگر یہ بھی غالب ہی نے سکھایا کہ لفظ کی پہنائی پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ سہا سے سمک تک سب کچھ اسی میں ہیں ۔ اور اس پہنائی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پھیلایا جا سکتا ہے ، سکیڑا جا سکتا ہے ساکت اور جامد بھی بنایا جا سکتا ہے اور حرکت اور نمو کی وہ بجلیاں بھی اس پہنائی کی رگ رگ میں سموئی جا سکتی ہیں کہ

ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا ، پایا

چنانچہ یہ خیال نہ کرو کہ لفظ کے معنی وہی ہیں جو بقول غالب کسی "ملائے مکتبی رام پوری" کسی قتیل ، کسی واقف کے ہاں ہیں ۔ لفظ میں معنی ڈالے جاتے ہیں ، کبھی لہجے سے کبھی خیال کی قوت سے ۔ کہ غالب نے خود برا کو اچھا کے معنوں میں استعمال کر دکھایا ۔ لفظ کے معنی بدلے جاسکتے ہیں ۔ جو عالمگیر جنگوں ، عالمگیر تحریکوں اور عالمگیر پبلیسٹی کے اس کواکب شکار اور آسماں گیر دور میں ہو رہا ہے اور لفظ میں معنی کبھی زندہ کبھی مردہ کر دیے جاتے ہیں کہ جیسے اب امن کا معنی کچھ نہیں اور جیسے قوت کا معنی اب پائندہ تر کیا جا رہا ہے ۔

یہ وہ فکری افق ہیں جو ہر دور میں غالب کے الفاظ اور ان کا استعمال مجھ پر اور ہر طالبِ معنی کے لیے منکشف کرتے رہے ہیں ۔

لفظ و معنی کے ربط باہم ، لفظ و معنی کے ظاہری رشتوں اور ان کے امکانات کا یہ سلسلہ بہت دراز ہے ۔ اس کے واسطے سے میں نے جب موقع ملا غالب کو پڑھا اور ان پر غور کیا اور ہر دفعہ مجھ پر فکر اور اظہار کے نئے افق ہویدا ہوئے ہیں ۔

پھر جینے کے قرینوں اور زندگی گزارنے کی اکھاڑ پچھاڑ کا مسئلہ ہے ۔ غالب کے ذہنی اور فکری افق کا احاطہ کرنے کے لیے تو ذہن اور فکر بھی اتنا ہی عظیم اور عریض ہونا چاہیے لیکن اپنی بساط مطابق ، میں نے ان کے کلام سے ان کی شخصیت سے اور ان کے اندازِ نظر سے ہمیشہ ہمت اور بے نیازی کا حوصلہ حاصل کیا ۔ وہ ہمارے جدید معنوں میں پیامی شاعر نہیں ۔ امید ، عمل ، جوشِ کردار کے مبلغ نہیں لیکن وہ ایک ایسا ادارہ ہیں جس میں زماں اور زماں کے اندر زندگی گم ہے ۔

یوں کہنے کو وہ رزق کی کمی کے شکوہ سنج رہے ۔ لیکن اس سے زیادہ شکوہ ان کو یہ تھا کہ نیر و شیفتہ ، صدر الدین آزردہ اور صہبائی موجود سہی لیکن میرے اندازِ نظر کی پہنائی کو جاننے کے لیے بیدلؔ کہاں سے آئیں ۔ اس لیے وہ زمانے سے اثر لیتے بھی رہے اور اس سے بے نیاز بھی رہے ۔

فنِ زندگی (آرٹ آف لیونگ) کا اہم نکتہ ہے کہ زندگی

ہزار رنگ اور بوقلموں ہے۔ حافظ کے لفظوں میں "عجوزِ ہزار داماد" ہے ۔ اسے اگر مہذب انسان کی طرح بسر کرنا ہے ، تو تمھیں بھی ہزار شیوہ بننا پڑے گا ۔ غالب کی شخصیت نے یہی بوقلمونی پیدا کی

دبیرم ، شاعرم ، رندم ، ندیمم ، شیوہ ھادارم

اور پھر جا کر یہ حوصلہ ، یہ ظرف ، یہ پہنائی ان میں آئی کہ ولی اور کافر کی منزلوں سے آگے بڑھے ۔ زندگی گزارنے کے لیے جو حوصلہ چاہیے ، غالب سے جو بھی حاصل کرے گا اسے ملے گا ۔

ایک بات اور جس نے مجھے ہمیشہ مسحور رکھا ہے ۔

ہم چاہیں نہ چاہیں زندگی کا ہر لمحہ پہلے کا قاتل بن کر سامنے آئے گا ۔ آج کی نورجہاں بیگم ، کل کی مہرالنسا کو ضرور جھٹلائے گی ۔ اور فردا کی ملکۂ عالیہ ، روش کی بیگم کا بطلان ضرور کرے گی ۔ یہ پیہم شکست ، یہ ریخت ، یہ بگاڑ اور یہ ہر آن نیا بناؤ (میں قصداً تغیر اور تبدیلی کی اصطلاحات سے گریز کر رہا ہوں) ہی ہر زوال ، ہر عبرت کی بنیاد ہے ۔

اب ذرا روح کائنات سے قریب آئیے۔ تو یہی نیا بگاڑ ، بناؤ ، حرکت اور نمو اور ارتقا کا طلسم نظر آئے گا ۔ خود اپنی محدود زندگی میں بھی دیکھا کہ ہر تغیر تبدیلی پر بہت بنے بگڑے مگر آخر کو یہی آج کا بگاڑ ، نمو اور ارتقا کی خدائی مصلحت

نظر آئی ۔ بہت پہلے غالب کے اس شعر کو سکول والوں نے محض تشریح کا بہانہ بنایا تھا جو آج بھی ہر مرحلے پر مشعل بن کر دمک اٹھتا ہے ۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تبدیلی اور ارتقا غالب کی اسی حوصلہ مندی کا ایک کرشمہ ہے جو ان کے عشق سے ، ان کے رشک دشمن سے ، ان کے فراق و وصال سے ، ان کے نعرہ

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ ، گھبرائیں کیا

سے ہر جگہ آشکار ہے ۔ کیونکہ ہر عظیم ذہن کی یہ خاص پہچان ہوتی ہے ۔ وہ اسی اصول کے کاربند ہوتے ہیں اور یہی وہ سکھاتے ہیں کہ زندگی کی ہر خاک اڑاتی راہ بھی گلزار کو جائے گی ۔

یاں جادہ بھی فتیلہ ہے ، لالہ کے داغ کا !

اور ان باتوں کے بعد پھر کلیات سامنے آتی ہیں اور اس ذہن کے بسیط حیرت خانے کے ایک جلوے سے زبان پر مہر لگ جاتی ہے ۔

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

ڈاکٹر محمد اجمل

بچپن میں اپنے گھر میں ہم غالب کو شاعری کا دیوتا سمجھتے تھے ، ہمارے گھر میں اُن کے وہ تمام شعر اکثر و بیشتر استعمال ہوتے تھے ، جو زباں زد خاص و عام تھے ، گھر کی فضا میں چونکہ پارسائی اور اداسی کا رجحان زیادہ تھا ، اس لیے یہ شعر بہت پڑھا جاتا تھا :

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں !
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں !

لیکن نوشابی کے عالم میں میں نے جب خود غالب کا مطالعہ کیا تو اردو کے اشعار سے زیادہ فارسی کے شعروں نے دل پر گہرا تاثر چھوڑا ، ایک شعر جو اُس وقت میری اپنی حساسیت کی ترجمانی کرتا تھا ، مجھے اکثر یاد آتا :

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

اور اس شعر کی وجہ سے ''چین پیشانی'' کا شعور مجھ میں شدید تر ہوتا گیا اور بسا اوقات اُس شعور میں گمان کا عنصر غالب ہوتا ۔ انسانی تعلقات کے چھوٹے چھوٹے صدمے اپنی

الم ناکی کو اس شعر میں ڈھال دیتے اور مجھے خاصا سکون حاصل ہو جاتا ، اسی طرح کا ایک اور شعر بھی ذہن پہ خاصی مدت تک حاوی رہا :

آغشتۂ ایم ہر سر خارے بخونِ دلِ
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

جوانی ہی کے عہد میں کئی مرتبہ غالب کا کوئی شعر ، جسے میں اپنی دانست میں فراموش کر چکا ہوتا ، خود بخود زبان پر وارد ہوجاتا اور کئی بار کی تکرار کے بعد مجھے احساس ہوتا کہ میں یہ شعر پڑھ رہا ہوں - ۱۹۵۰ع کی بات ہے کہ لندن میں ایک دوشیزہ سے کسی قدر دل بستگی ہوگئی ، لیکن چند معقول اور بیشتر نامعقول وجوہات کی بنا پر میں نے اُس سے کنارہ کشی کرنے کا ارادہ کر لیا ، رہتے ہم ایک ہی ہوسٹل میں تھے ، اس 'عزم بالجزم' کے بعد دوپہر کے کھانے پر میں نے اُسے دیکھا ، لیکن کوئی بات نہ کی اور دور دور رہا ، اُس نے بھی میرے تیور پہچان کر کوئی بات نہ کی ، کھانا کھانے کے بعد جب میں لائبریری کی طرف چلا ، تو خیال آیا کہ پندرہ بیس منٹ سے میں یہ شعر گنگنا رہا ہوں :

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہواتھا

پھر اقبال کے زیر اثر ایک دور ایسا بھی آیا جس میں غالب کے

باغیانہ اور انقلاب پسندانہ اشعار زیادہ پسند آنے لگے ، بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم سے لے کر بوادی' کہ دراں خضر را عصا حفتست اور ہوا مخالف و شب تار و بادِ طوفاں خیز تک حرز جاں بن گئے اور میں انھیں اکثر پڑھتا اور سر دھنتا لیکن کوئی بیس برس سے غالب کا جادو ٹوٹتا جا رہا ہے - اب اس کی انانیت میں خود فریبی اور خود ناشناسی کا پہلو زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے ، عشق میں سر پھوڑنا چاہتا ہے لیکن خاص اہتمام سے کہ محبوب کا سنگ آستاں نہ ہو ، سوچتا محبوب ہی کے متعلق ہے ، سر بھی آسی کے لیے بھوڑتا ہے لیکن ”سرگشتگی رسوم و قیود ، اس قدر شدید ہے کہ اس مقدس فریضے کے لیے کوئی اور آستانہ ڈھونڈتا ہے گویا سر عشق کا ارمغاں نہیں ، شکستہ انا کی جھنجھلاہٹ اور بے زاری ہے ، دیر و حرم کو بھی اپنی واماندگی شوق کی پناہ سمجھتا ہے ، ہر شعر میں 'انا نوازی' کرتا ہے ، اور التباس کو قبول کرتا ہے ، ”ہم انجمن سمجھتے ہیں ، خلوت ہی کیوں نہ ہو“ سے اس التباس ذہنی کا پتہ ملتا ہے ، خلوت غالب کے لیے انجمن نہیں - آسے خلوت کو انجمن 'سمجھنا' پڑتا ہے - التباس صحیحہ ، تو تخلیقی عمل کے لیے لازمی ہے، لیکن غالب جا بجا التباس کاذب کا بھی شکار ہو جاتا ہے اور اس التباس کاذب کو ندرت زبان کے ذریعے دل آویز اور دل پذیر بنانا چاہتا ہے :

بیا ورید گر این جا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

یہی وجہ ہے کہ مجھے اب غالب کے مقابلے میں میر بہت بڑا شاعر نظر آتا ہے اور خوشی ہو یا ملال ، لذت ہو یا الم ، غالب پڑھنے سے وہ روحانی اہتزاز حاصل نہیں ہوتا جو میر کے مطالعے سے ہوتا ہے -

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

غالب سے میری شناسائی کا آغاز کوئی تیس برس قبل ہوا جب کہ میں مرحوم ریاستِ حیدر آباد میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نصاب میں اردو نظم و نثر کا جو انتخاب شامل تھا وہ مولوی عبدالحق کا مرتب کردہ تھا اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس میں غالب کی چند غزلیں تھیں جو سہل ممتنع انداز کی تھیں، چند مکاتیب تھے جو غالب نے تفتہ، مجروح اور سالک کے نام لکھے تھے، اس کے علاوہ مولانا حالی کی یادگار غالب سے وہ اقتباس بھی تھا جس میں غالب کے اخلاق کا تذکرہ ہے۔ گویا اس انتخاب میں غالب کا تعارف شاعر، نثر نگار اور انسان تینوں حیثیتوں سے کرا دیا گیا تھا۔ اساتذہ نے یہ منتخبات جس طرح پڑھائے اور سمجھائے تھے اس سے میرے ذہن میں غالب کی عظمت کا تاثر اسی زمانے میں پیدا ہو گیا تھا جو مرور ایام کے ساتھ برابر گہرا ہوتا گیا۔ دیوان غالب اکثر زیر مطالعہ رہنے لگا اور کچھ عرصے میں تقریباً سبھی اچھے شعر زبانی یاد ہو گئے۔ زندگی میں بیسیوں ہی ایسے تجربے اور مشاہدے پیش آئے جب کہ

صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کے لیے غالب ہی کا کوئی شعر یاد آیا اور محسوس ہوا کہ شاید یہ شعر خاص اسی موقع کے لیے لکھا گیا تھا - خیالات و جذبات کی ہمہ گیری اور عام انسانی مسائل و کامرانی ، آرزوؤں اور امنگوں کا حکیمانہ و شاعرانہ بیان جس میں امید و بیم ، تمنا و شکست تمنا ، مسرت و الم ، حسرت و کامرانی ، رجائیت و قنوطیت ، غرض ہر قسم کے احساسات و تاثرات کا احاطہ کر لیا گیا ہے ، غالب کی یہی خصوصیت ہے جس نے میرے دل و دماغ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے - لطف کی بات یہ ہے کہ خواہ کوئی شخصی صورت حال ہو یا سماجی یا سیاسی یا فکری غالب ہی کے شعر مطابق حال معلوم ہوتے ہیں - اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں - میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں - یوں غالب نے ذیل کا شعر بظاہر محض حسن و عشق کے موضوع پر کہا ہے -

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لیکن یہی شعر اس وقت بھی یاد آتا تھا جب آزادی ہند کی جد و جہد میں گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے ذریعے انگریزی حکومت سے لڑائی شروع کی تھی - یہی شعر اس وقت بھی یاد آیا تھا جب مرحوم ریاست حیدرآباد

کے پر خلوص مگر جذباتی قائد سید قاسم رضوی بھارتی حکومت کے خلاف تقریریں کرکے لال قلعے پر آصفی جھنڈا لہرا دینے کے دعوے کیا کرتے تھے اور پھر یہی شعر زبان پر اس وقت آتا تھا جب عرب ملکوں کے سربراہ اسرائیل کے خلاف بلند بانگ دعوے کرکے اسے صفحۂ ہستی سے نابود کر دینے کے عزم کا اعلان کرتے تھے ۔ ان حالات کے علاوہ عام زندگی کے تجربات و مشاہدات میں بھی یہی شعر بیسیوں دفعہ یاد آیا ہے اور میں دل ہی دل میں حیران رہ گیا ہوں کہ غالب نے کیسے شگفتہ و دلکش انداز میں کیسی عمدہ بات کہی ہے جس کی پہلو داری کا کچھ ٹھکانا نہیں ۔ ہر اس موقع پر جب کہ یہ شعر یاد آیا ہے میں خود صورت حالات میں جذباتی و شخصی طور پر شریک (involved) کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس شعر کے ذہن میں آتے ہی گویا ایک طرح کی خارجیت (objectivity) پیدا ہو جاتی تھی جس سے جذباتی تناؤ دور ہو جاتا تھا اور میں دل ہی دل میں غالب کی طرح ہنس پڑتا تھا ۔

اپنے آپ کو خود سے علیحدہ ہو کر دیکھنا اور اپنی کوتاہیوں اور حماقتوں پر ہنسنا، یہ بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جو غالب سے مخصوص ہے اور غالب کا مطالعہ کرنے والوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے ۔ غالب کی اس خصوصیت

کا اندازہ بھی مجھے زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا جب سالک کے نام غالب کا وہ مکتوب پڑھا تھا جس میں وہ کہتا ہے۔ ''اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب تو قرضداروں کو جواب دے، سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا بڑا کافر مرا ... آئیے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے، میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دونگا'' اور اسی زمانے میں وہ غزل بھی پڑھی تھی جس میں یہ شعر آتا ہے۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالب سے یہ رویہ سیکھنے کی وجہ سے زندگی کے کتنے

ہی مرحلے آسان ہو گئے ، حسِ ظرافت جاگ اٹھی - جن باتوں سے اور جن موقعوں پر عام طور سے اپنی انانیت و خود پرستی کے باعث غصہ ، جھنجھلاہٹ یا کوفت پیدا ہو جاتی ہے ایسے موقعوں پر غالب کے شعر یاد آ گئے اور غصہ یا جھنجھلاہٹ تو در کنار ہنسی کی ایک لہر دل میں دوڑ گئی اور ذہنی و جذباتی گھٹن فوراً دور ہو گئی -

غالب کی ہمہ گیری و پہلوداری اور حسِ ظرافت کے علاوہ جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے وہ ہے غالب کی انسانیت ، وسیع المشربی جو نہ صرف اس کی شاعری اور مکتوبات سے ہویدا ہے بلکہ عملی زندگی سے بھی - تفتہ کو ایک خط میں کس خلوص سے لکھتا ہے - ''میں تو بنی آدم کو ، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی ، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں ، دوسرا مانے یا نہ مانے - مذہب یا فرقے کی بنا پر جو تنگ نظری آدمی میں پیدا ہو سکتی ہے اس کو غالب کی شخصیت اور اس کی تحریروں کا مطالعہ دور کر دیتا ہے - اس موضوع پر کیسے کیسے شعر کہے ہیں -

خوش بود فارغ ز بند کفرو ایمان زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یہی وسعت قلب اور وسعت نظر غالب نے اور معاملات میں بھی سکھائی ہے جس سے ہماری قدریں بلند تر ہو جاتی ہیں اور ہمارے فکر و عمل کے محرکات بدل جاتے ہیں۔ کون ہے جو غالب کے ان شعروں سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے؟ مجھے تو ایسے شعروں نے بہت متاثر کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا درواز پائیں گر کھلا

غرض غالب نے پچھلے تیس برسوں میں نہ صرف میری ذہنی، فکری و جذباتی رفاقت ہی کی ہے بلکہ رہنمائی بھی کی ہے اور رفاقت و رہنمائی کا یہ سلسلہ اب بھی برابر جاری ہے۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے، مطالعے اور مشاہدے میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، غالب کی شخصیت اور اس کی

تصانیف کے نئے نئے گوشے فکر و نظر کے سامنے آتے جاتے ہیں اور ہزار دفعہ بڑھے ہوئے شعر پھر نئے معلوم ہونے لگتے ہیں - جس طرح گوئٹے نے کہا تھا کہ ہر روز ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے اسی طرح میں دیوان غالب کے بارے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہر روز ایک نیا دیوان تخلیق ہوتا ہے - لیجیے اس پر غالب ہی کا ایک اور مطابق حال شعر یاد آ گیا -

لوگوں کو ہے خورشید جہانتاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

صدیق کلیم

شروع ہی سے ہم یہ سنتے آئے تھے کہ غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے - جب میں بی - اے کا طالب علم تھا تو میں اس رائے کا جس سے کہ مجھے اتفاق تھا تجزیہ کرنے سے قاصر تھا - اس وقت غالب کی غزلیں ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتی تھیں اور اسی تاثر کو ہم اس کی عظمت کا ثبوت سمجھتے تھے - جب میں ایم - اے کا طالب علم تھا تو میں نے ایسے سوالات کا جواب تیار کرنا شروع کیا - کم از کم ذاتی اطمینان کے لیے - اگر ہم ایک شاعر کو اچھا شاعر کہتے ہیں تو کن خصوصیات کی بنا پر ؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا مشکل ترین تنقیدی کوشش تھی - پہلے میں نے شیکسپئر کی کی عظمت کو متعین کرنا چاہا - اس لیے میں نے اس کے تمام ڈراموں کا مطالعہ کیا - چند تنقدی کتابیں بھی پڑھیں اور یہ نتجہ اخذ کیا کہ شیکسپئر نے مختلف النوع کرداروں کی تخلیق کی ہے اور ہر واقعہ (خیال اور جذبہ جو اس واقعہ ہی میں جنم لیتے ہیں) کے مختلف النوع پہلوؤں کی رمزیہ تصاویر میں نشان دہی کی ہے - اسی سلسلے کی تکمیل ۱۹۴۷ء میں ہوئی

جب میں نے اردو میں شیکسپئر پر ایک کتاب لکھی -

اس طرح میں نے غالب اور اقبال کی عظمت کا تجزیہ بھی کیا - وہ کچھ اس طرح تھا - غالب نے مغلیہ ثقافت کی شان و تمکنت اور اس جیتی جاگتی زندگی کو جس نے اسے تخلیق کیا تھا اپنی شاعری میں سمو لیا ہے اس امتزاج میں وہ انتشار اور شکستگی بھی شامل ہے جو اس تہذیب ہی کی تخلیق تھی - اس لیے ذو معنویت غالب کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت ہے - اس زمانے میں ہم نے اردو کلاسیکل شاعری (ولی سے اقبال تک) کا بھی مطالعہ کیا تھا اس لیے غالب کی شاعری اس پس منظر پر اپنی تمام رعنائی کے ساتھ ابھرتی تھی - اس وقت مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اقبال اردو کا عظیم ترین شاعر ہے نہ کہ غالب - شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اقبال ہم لوگوں سے بہت نزدیک تھے - جب اقبال کی وفات ہوئی تو اس وقت ہم لوگ فرسٹ ایئر میں پڑھتے تھے - ہم نے ڈاکٹر تاثیر مرحوم کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا - اس واقعے کا ہم پر بہت گہرا اثر ہوا - دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے ایسی شاعری میں فطرتاً بہت زیادہ دل چسپی تھی جو خیالات اور فلسفیانہ نظریوں سے جنم لیتی ہے - اقبال نے جس انداز میں اور جس سطح پر علمی مسائل کا تجزیہ کیا تھا اس نے ہم پر بہت گہرا تاثر چھوڑا تھا -

ان دنوں ہم جدید شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کا کلام ہمیں مرغوب تھا اگرچہ ذاتی طور پر میں حسرت موہانی کی شاعری کا انتہائی دلدادہ تھا۔ ان کے علاوہ فیض، راشد اور میرا جی ہمیں اچھے شاعر معلوم ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہماری زندگی کے بہت قریب تھے۔ غالب اپنی عظمت کے باوجود ہماری زندگی سے بہت دور تھا۔ غالب کی میرے لیے کوئی ہم عصری قدر نہیں تھی۔ میں نے اپنی شاعری کے سلسلے میں بھی غالب سے کچھ نہیں سیکھا۔ ہم نے اُس فضا میں آنکھیں کھولی تھیں جس میں ایک نئی دنیا کی تخلیق پر زور تھا۔ اُس وقت انگریز سامراج کے خلاف بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ اس دنیا نے ہمیں مثالیت پرستی سکھائی اور ایک قابل قدر آدرش بھی دیا۔

یوں تو غالب کا مطالعہ وقتاً فوقتاً کئی بار کیا ہوگا۔ لیکن اپریل ۱۹۵۱ء میں جب میں نے غالب کو پھر پڑھا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ غالب شاید کوئی جدید شاعر ہے۔ اس وقت اس کی ذو معنویت اور ایجاز و اختصار میں پوشیدہ ہلکا ہلکا طنز اور تلخی ہی صحیح طریقہ شعر گوئی معلوم ہوا۔ اس عرصے میں میں جدید انگریزی اور فرانسیسی شعرا کے کلام کا مطالعہ کر چکا تھا اور جدید شاداب شعری تکنیکوں اور ویران تجربات کی رہ گزاروں سے گذر چکا تھا۔ اس پس منظر پر

بھی غالب کی شاعرانہ تصویر اُبھرنے لگی ۔ اُس کی مزید تصاویر اور علامات نے اُس کے تجربے میں ویرانی اور شکستگی اور دردناکی کو جیسے میرے اپنے تجربات میں ڈھال دیا ہو اور وہ بھی ایک ایسی دنیا کے نقشے کے اندر جو خوب صورت ہی نہیں پروقار بھی تھی ۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ غالب میرے لیے اور میرے بعض احباب کے لیے بھی زندہ شاعر ہوتا چلا گیا ۔ اب اس کے اشعار کی گمبھیرتا ہم پر آہستہ آہستہ کھلنے لگی ۔ جیسے کہ علم و ادب کے طلبا کو معلوم ہے افہام اور استحسان کی کئی سطحیں ہیں ۔ غالب کو ہم اپنے بی ۔ اے کے زمانے میں بھی سمجھتے تھے ۔ ہم نے اُس کی کئی شرحوں کا مطالعہ کیا تھا ۔ شیخ محمد اکرام اور عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقیدیں بھی دیکھی تھیں لیکن غالب کا یہ استحسان ، یہ تجربۂ غالب ، کہ غالب کی شاعری ہماری ہی زندگی سے عبارت ہے ۔ یہ ہمیں کبھی بھی نصیب نہیں ہوا تھا ۔ پاکستان میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اقدار کی بڑھتی ہوئی شکست و ریخت ہمیں غالب کے قریب لے گئی ۔ یا غالب کو ہمارے قریب لے آئی ۔ زندگی کے ان بھیانک طور پر اُداس لمحوں میں جب اتھاہ ویرانی چھا جاتی ہے :

سر پر ہجوم دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

یا

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

یا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

ہی عظیم شاعری معلوم ہوتی ہے یا اس سے کسی قدر مختلف موڈ میں۔

سادگی و پرکاری بےخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

چنانچہ اس تجربے کا اظہار غالب پر اک مختصر مضمون کی صورت میں ہوا جو پاکستان ریویو ۱۹۶۵ء کے غالب نمبر میں شایع ہوا۔ آج مجھے اقبال ہماری زندگی سے دور اور کبھی بہت دور نظر آتا ہے اور غالب نزدیک۔ کبھی بہت ہی نزدیک غالب کے کلام کی سج دھج اور اس کے اندر دردناکی۔ شکستگی اور انتشار جو تشکک کے مزاج میں گوندھ کر ہمارے سامنے آتے ہیں درباری راگ کی سی تمکنت اور وقار کے ساتھ۔ مگر یہ اس شاعر کا وقار ہے جو مرگ اور فنا کے فلسفے سے آشنا ہے۔

اور یہ بھی کہ اس فنا میں بھی زندگی کرنا انسان ہی کا کام ہے ۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک غالب کے بے معنوی ادب (Literature of the Absurd) سے بھی ڈانڈے مل جاتے ہیں اور وجودیت (Existentialism) سے بھی ۔ غالب زندگی کا رسیا ہے اور یہی زندگی کرنا اس کے فن کی جان ہے اگرچہ :

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

لیکن

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

اور

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ڈاکٹر وزیر آغا

آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ ایک روز میرے والد کو نجانے کیا سوجھی کہ مجھے سیر کے بہانے گاؤں کے پرائمری سکول میں لے گئے اور پھر وہیں چھوڑ آئے۔ میں سکول کی دیواروں پر بنی ہوئی تصاویر کو دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ والد صاحب کے چلے جانے کا مجھے علم تک نہ ہو سکا اور جب علم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی لق و دق صحرا میں کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی زمین میں جلاد ایسی مونچھیں اُگ آئی ہیں۔ پھر دفعتاً یہ ساری مونچھیں سمٹ کر سکول کے ماسٹر صاحب کے بالائی ہونٹ کی محراب پر جمع ہوگئیں اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ ان مونچھوں سے ذرا اوپر دو ویران سے غار منہ کھولے کھڑے تھے اور ان غاروں سے ذرا اوپر دو سرخ انگارہ آنکھیں تیروں کی طرح اترتی میرے سارے بدن کو چھلنی کر رہی تھیں۔ چنانچہ حفاظتِ خود اختیاری کے تحت میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے میرے گالوں پر لڑھکنے لگے۔

ان آنسوؤں کو دیکھتے ہی اُن لال انگارہ آنکھوں میں نفرت کی ایک تیز سی کٹار ابھری جس نے میرے آنسوؤں کی طغیانی کو اور بھی تیز کر دیا ۔ مگر عین اس وقت ماسٹر صاحب نے دائیں بائیں ایک نظر ڈال کر اپنی جیب سے ایک نازک سی رنگین پنسل نکالی اور پھر جلدی سے میرے ہاتھوں میں تھما دی اور پنسل کے اِس لمس میں نجانے کیسا اعجاز تھا کہ میری پلکوں پر چمکتے ہوئے آنسو وہیں رک گئے اور میرے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ میں ڈوبتے چلے گئے ۔ اُس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بھیگی ہوئی چلمن میں سے کسی روشن اور تابناک دنیا کا نظارہ کر رہا ہوں ۔

اس واقعے کے کئی برس بعد جب میں کالج میں تعلیم پاتے ہوئے ایک روز غالب کے دیوان سے متعارف ہوا تو مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے زمانے نے ایک اُلٹی زقند بھری ہے اور میں واپس گاؤں کے پرائمری سکول میں پہنچ گیا ہوں ۔ غالب مجھے ایک پریشان حال لڑکے کے پیکر میں نظر آیا لیکن اس طور کہ اس کی پلکیں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں اور ہاتھوں نے انگنت رنگین پنسلیں تھام رکھی تھیں ۔ غالب سے قبل میں نے فانی کا مطالعہ کیا تھا اور خود کو ایک ایسی سر زمین پر سر گردان پایا تھا جہاں بادلوں کا سائبان تنا ہوا تھا اور یہ سائبان کسی مجبور کی انکھ کی طرح ہولے ہولے ٹپکتا چلا

جاتا تھا - پھر میں نے اکبر کا مطالعہ کیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی جلی جھلسی ہوئی کائنات میں ڈھکیل دیا گیا ہوں اور میرا سارا جسم سورج کی تیزشعاعوں سے پارہ پارہ ہوگیا ہے - لیکن غالب کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے برسات کی وہ شام یاد آ گئی جب موٹے موٹے بادلوں میں ایک شگاف سا پیدا ہو جاتا ہے اور اس شگاف میں سے سورج کی دز دیدہ نگاہیں ہر شے پر رنگوں کی جوالا انڈیل دیتی ہیں - آنسو اور تبسم ایک دوسرے سے ہم کنار ہو جاتے ہیں اور زندگی اپنے دکھوں اور مصیبتوں کے باوجود نہایت خوبصورت ، لطیف اور قیمتی نظر آنے لگتی ہے - مجھے غالب آنسوؤں میں مسکراتا ہوا دکھائی دیا - وہ ایک ایسا انسان نظر آیا جسے بیک وقت غم اور خوشی کا عرفان حاصل ہو چکا ہو - بعض شاعر خوشی سے اس درجہ ناراض ہو جاتے ہیں کہ اُن کے ہاں غم کی گھری روشنی کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا اور بعض اندر سے تو ٹوٹ پھوٹ رہے ہوتے ہیں لیکن دنیا کو دکھانے کے لیے اپنے ہونٹوں پر تبسم کی ایک جھالر سی آویزاں کرلیتے ہیں - غالب مجھے ان دونوں قسم کے شعرا سے مختلف نظر آیا - مجھے محسوس ہوا غالب کے ہاں جس طرح غم فطری ہے اس طرح تبسم بھی خود رو ہے - مطلب یہ کہ غالب ریا کار ہرگز نہیں ہے - اُسے جب چبھن محسوس ہوتی ہے تو رو پڑتا ہے اور جب روتے روتے

محسوس کرتا ہے کہ کسی نے رنگین پنسل اس کے ہاتھ میں تھما دی ہے تو بے اختیار ہنسنے لگتا ہے ۔ مسکراہٹ کا یہ لمحہ جب غالب کا ازلی ابدی غم ایک نئی نویلی مسرت سے ہم کنار ہوتا ہے ۔ ایک ایسا نایاب لمحہ ہے جو غالب کو عام شعر کی سطح سے بہت اوپر اٹھا دیتا ہے ۔ زیاں کا ایک شدید احساس اور پھر اس شدید احساس کی مضحکہ خیزی کا ایک گہرا شعور ۔ عرفان کا یہ مقام غالب ہی کو حاصل ہوا ہے اور غالب کے ذریعے ہی مجھ ایسے لاکھوں انسانوں تک پہنچا ہے جو زندگی کو اس کی الائشوں اور مصیبتوں کے باجود ایک بیش بہا نعمت سمجھتے ہیں ۔

میں نے اپنی زندگی میں غالب کے علاوہ اقبال کا بھی مطالعہ کیا ہے ۔ اقبال ایک عظیم شاعر ہے اور اس کی شاعری نے لاکھوں اذہان کو منزل سے آشنا کیا ہے لیکن میں اقبال سے مرعوب تو ہوا خود کو اس کے حلقۂ احباب میں شامل کرنے پر کبھی مائل نہ کر سکا ۔ ہر بار جب میں نے اقبال کو پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے ریلوے سٹیشن پر آواز کے آلے سے یہ اعلان نشر ہو رہا ہو کہ "مسافرو ! جلدی کرو ، بھاگو ، دوڑ ، ۱۵ اپ ٹرین کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں" ۔ دوسری طرف غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے میری چشم تصور نے دیکھا کہ اعلان کے شور اور انجن کے

اضطراب سے بے نیاز کوئی شخص پلیٹ فارم کے ایک شکستہ بنچ پر اکڑوں بیٹھا کتاب کے مطالعہ میں غرق ہے ۔ وہ اعلان کو سن کو ایک لحظہ کے لیے اپنی نظریں کتاب کے اوراق سے ہٹاتا ہے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے میں پوچھتا ہے ''جناب ! اس کے بعد دوسری گاڑی کیے بجے جائے گی ؟" ——اور جواب پا کر بڑے اطمینان سے دوبارہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا ہے ۔ غالب کو کسی بات کی بھی جلدی نہیں ۔ اس کے سامنے زندگی اپنی تمام تر سلوٹوں کے ساتھ بچھی ہوئی ہے ۔ ہر سلوٹ ایک خواہش ہے اور ہر خواہش پر اُس کا دم نکلنے کو تیار ہے مگر ساتھ ہی اُسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ یہ ساری سلوٹیں بے معنی ہیں اور قدرت نے انسان کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے ! غالب کے سامنے نہ تو کوئی تعمیر کا منصوبہ ہے اور نہ اُسے کسی ارفع منزل ہی کی تلاش ہے ۔ اُسے تو صرف اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے غرض ہے کہ آج کس دوست کا خط آیا یا شام کس طرح بسر ہوگی یا پھر اپنی ذات ، اپنی انفرادیت کو زمانے کی آندھی سے محفوظ رکھنے کے لیے آج کیا تدارک کرنا ہوگا ؟ غالب شخصیت کے بوجھل لبادے سے گریزاں لیکن انفرادیت کے چار گرہ کپڑے کا والہ و شیدا ہے ۔ وہ کسی دوسرے کے کنوئیں سے اپنے باغ کو سیراب

نہیں کرتا بلکہ اس کی آبیاری اپنی ذات کے مخفی چشموں سے کرتا ہے۔ لیکن یہ ذات کیا ہے؟ ایک جہان ہوش ربا جو کسی تمثال دار آئینے کی طرح ہزار ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود آرزؤں کے ایک شہر کی صورت میں قائم ہے۔ غالب جب اپنے اس آئینہ خانے سے مجھے آشنا کرتا ہے تو آواز کو دگنا کرنے والے آلے کا سہارا نہیں لیتا بلکہ چپکے سے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ میرے اندر چھپے ہوئے "دیدۂ عبرت نگاہ" کو متحرک ہی نہیں کرتا۔ ضرور کرتا ہے مگر ساتھ ہی اپنی ایک آنکھ میچ کر عبرت اور ندامت کے سارے تصور کو خندۂ استہزا میں بھی اڑا دیتا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ غالب ایک ایسا نقطہ ہے جہاں دو زمانے آ کر ملتے ہیں اور جہاں سے ایک تیسرا زمانہ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ غالب وہ بھیگی سی مسکراہٹ ہے جو جلاد ایسی مونچھوں اور بلکتے ہوئے آنسوؤں کے تصادم سے جنم لیتی ہے اور پھر ایک نئے عہد کا سمبل بن جاتی ہے۔ مجھے غالب کی یہ نٹ کھٹ معصوم اور بے داغ ادا پسند ہے کہ اس میں زفاقت کا احساس بھی ہے اور عرفان کے کوندے کی لپک بھی!

جیلانی کامران

میں نے "استانزے" کے پیش لفظ میں غالب کا خاص طور پر ذکر کیا ہے - یہ پیش لفظ ۱۹۵۷ء میں ایڈنبرا میں لکھا گیا تھا اور جو کچھ اس میں کہا گیا تھا اس سے ایک نئی شعری زبان کو دریافت کرنا مقصود تھا - میں نے نئی شعری زبان ہی کے ضمن میں غالب کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ غالب در حقیقت ایک ایسے تخیئل کی نمائندگی کرتا ہے جو ہر اعتبار سے آزاد ہے اور جس کے سامنے ہر نوع کی پابندی بے معنی ہے - نئی اردو شاعری کے مطابق غالب ایک پابند شاعر ہے اور غزل کے پیرائے میں گفتگو کرتا ہے اور شعر کے بارے میں جس عقیدے کو مانتا ہے وہ الہامی اندازِ فکر کا پیدا کیا ہوا ہے - ظاہر ہے کہ جب میں غالب کے آزاد تخیئل کا ذکر کرتا تھا تو میں نے ان سچائیوں کا انکار نہیں کیا تھا - غالب کی شعری زبان میرے خیال میں، لفظ اور معنی کے مربوط ہونے سے پیدا ہوتی ہے - یعنی نہ تو لفظ باقی رہتا ہے اور نہ معنی ہی قائم رہتا ہے بلکہ ان دونوں کے ربط سے استعارہ پیدا ہوتا ہے - عام حالات میں استعارے کی

موجودگی تخیئل شعری کا باعث ہوتی ہے۔ آزاد تخیئل اس لیے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے استعارہ وضع کرنے کی حدود کا تعین نہیں ہو سکتا۔ غالب کی شعری زبان کا چہرا استعاروں کا چہرا ہے۔ اور یہ استعارے غالب کی شاعری کو مقام و وقت، زمانے، شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات سے بے نیاز کرتے ہیں۔ میں جس سچائی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ زبان اور آزاد تخیئل کے باہمی عمل سے شعری زبان پیدا ہوتی ہے۔ "استانزے" کے ذریعے میرے سامنے کچھ ایسا ہی مقصد تھا۔

میری ذہنی اور فکری تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے منظریات کی بڑی اہمیت تھی۔ ۱۹۴۷ء تک حلقۂ ارباب ذوق، شاعر کی اندرونی کائنات کا ذکر کرتا تھا اور ترقی پسند تحریک افراد کے عذاب اور آشوب سے موضوع اخذ کرتی تھی۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں، اور جب میں نے "استانزے" کا پیش لفظ لکھا تھا، اس وقت میرا فکری اور ادبی ماحول بہت حد تک بدل چکا تھا، اور مجھے اپنی تربیت کے ابتدائی اثرات کچھ زیادہ مفید دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایسے زمانے میں میرا کلام غالب سے دوبارہ تعارف ہوا۔ مجھے غالب کے کلام میں آزاد تخیئل کے ساتھ ساتھ اضافتیں دکھائی دیں اور محسوس

ہوا کہ غالب اضافتوں کی مدد سے جہاں اختصار پیدا کرتا ہے وہاں یہ اضافتیں در حقیقت تخلیقی تصورات کی لا محدود زرخیزی کو محفوظ بھی کرتی ہیں - میں نے کئی بار اضافتوں کو کھول کر اشعار کی صورت دیکھی تو مجھے تصورات کے ایسے علاقے دکھائی دیے جن سے میری پہلے آشنائی نہیں تھی - اس وقت میں نے خیال کیا کہ اضافتوں کے پیچھے تصورات کی موجود دنیا ، نئی اردو شاعری کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ یہ تصورات متحرک ہیں اور ان کی حرکت موجود سے موہوم کی جانب ہے - لیکن جو بات عجیب دکھائی دی یہ تھی کہ ان تصورات کی حرکت سے موہوم ، موجود بنتا تھا اور موجود کی سرحدیں پھیلتی تھیں - غالب کی شاعری میں مجھے ایک ایسا انسان دکھائی دیا جو موجود کو موہوم پر فتح یاب ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے - نئی اردو شاعری بھی موجود کی سرحدوں کو پھیلانے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے - اور اس طرح مغربی شاعروں سے کہیں زیادہ غالب کی احسان مند ہے -

غالب غالباً پہلا اردو شاعر ہے جو سوال پوچھتا ہے اور ان سوالوں کی روشنی میں اپنی واردات کو ترتیب دیتا ہے - سوال پوچھنے کا یہ طریقہ مجھے غالب کی شاعری میں اس لیے پسند آیا کیونکہ ان سوالات کی مدد سے شاعر اپنے تجربے کو

پہچاننے پر قادر ہوتا تھا ۔ نئی اردو شاعری میں جہاں کہیں ذات کے حوالے سے سوالوں کو اٹھایا گیا ہے وہاں اس طریق کار کے پیچھے غالب ہی کا طریق کار مصروف عمل ہے ۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ نئی اردو شاعری کی تنقیدی وضاحت کا فرض بڑی حد تک مجھ پر رہا ہے اور میں نے ان وضاحتوں کے لیے جن تجربات اور شعری علوم سے استفادہ کیا ہے ان میں غالب کے اس طریق کار کی حیثیت مرکزی ہے ۔

بارہ چودہ برس کی شعری کارگزاری کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ میں نے اپنے طور پر غالب سے کہاں تک استفادہ کیا ہے ۔ تاہم ایک سرسری انداز میں یہ سچائی بھی واضح کی جا سکتی ہے ۔ مثلاً "استانزے" کی ایک نظم میں ، میں نے "دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر" ہی سے تجربے کی نشاندہی کا آغاز کیا تھا ۔ اس بند کا تذکرہ مناسب دکھائی دیتا ہے بند یہ ہے :

"میں، دسمبر کا خنک ہاتھ تو اپرل کی کلی،
تو ستاروں کی خریدار ، میں خواہاں تیرا

دسترس تجھ کو ، نہ حاصل مجھ کو !"
عمر شبنم کا بدن چوم چکی ہے تجھ پر

بند کلیوں کی طرح تو ہے کشش آج مجھے
ہے دل قطرہ اگر بحر، تو ساحل مجھ کو !"

میں نے غالب کے فکری اثر کو ظاہر کرنے کے لیے آخری سطر کے پہلے حصے کے نیچے لائن کھینچ دی ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ غالب کی شاعری علمی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ شاعری کتابوں کی شاعری ہے۔ غالب کی شاعری میں غزل، داستان اور فلسفے کی ترکیبیں اور اصطلاحیں علامتوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ غالب ان علامتوں کی مدد سے عشق کو نہ صرف سمجھنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے بلکہ ان علامتوں کی مدد سے عشق کو دریافت موہوم کی خاطر استعمال بھی کرتا ہے۔ اور اس طرح عشق موہوم کو موجود میں بدل دیتا ہے۔ صحرا، وحشت، بیابان اور باغ کی حیثیت خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے۔ یہ اصطلاحیں تجربے کے مقامات کو بیان کرتی ہیں اس کے علاوہ غالب کی شاعری میں ''قبلہ نما'' کی جانب ایک سفر کا ذکر بھی ہے۔ قبلہ نما کو موجود میں قائم کر کے غالب 'قبلہ' کی دریافت کرتا ہے۔ اور اس طرح ایک ایسے وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے اس نے الٰہی صفات میں مشاہدہ کیا ہے۔ غالب کا محبوب اس اعتبار سے مذہبی اصطلاحوں کے ''خدا'' سے کم اور انسان سے بلند تر مرتبے کا حامل ہے۔ میں اپنی رائے کی حمایت میں ''ولی پوشیدہ اور کافر کھلا'' کو پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ غالب کی شاعری میں

سیکولر انسانی واردات کو مجاز و حقیقت کی مذہبی زبان میں بیان کیا گیا ہے اور اس طرح مشاہدے کو موجود اور وجود کے اتصال کی صداقت کے طور پر پیش کیا ہے۔

فکری طور پر ایسا طریق کار درِ حقیقت دو مختلف دنیاؤں کے مابین رابطے کو پیدا کرتا ہے۔ غالب کی شاعری میں سیکولر واردات، وحدت‌الوجود کی اصطلاحوں کے ذریعے شہود کو ''غیبِ غیب'' میں بدل دیتی ہے اور اس طرح دو محبوب وضع کرتی ہے۔ ایک کی صورت زمینی ہے اور دوسرے کی صورت غیر زمینی ہے۔ یہ دوسری صورت نہ تو خدا کی مظہر ہے اور نہ انسان کے نقش میں ظاہر ہوئی ہے یہ صورت بیک‌وقت موہوم ہے اور بیک وقت ظاہر ہے۔ غالب کی شاعری میں ظاہر اور موہوم کی ایسی کیفیت مجھے ہر اعتبار سے منفرد اور قابل ستائیش دکھائی دی ہے۔

اتنا کچھ کہہ کر یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ غالب کی شاعری میں جن دنیاؤں کی جانب میں نے مختصراً اشارہ کیا ہے یہی دنیائیں نئی اردو شاعری میں از سر نو برآمد ہو رہی ہیں۔ میں نے اور میرے ساتھ دوسرے اردو شاعروں، مثلاً افتخار جالب، عباس اطہر، انیس ناگی زاہد ڈار اور فاروق حسن نے ہمہ اوست یا ہمہ از اوست کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ موجود کی سرحدوں پر موہوم کو لباس پہنانے کی آرزو

کی ہے - اور اس طرح زمین کے سکھائے ہوئے علوم کی مدد سے ایک غیر زمینی علاقہ، دریافت کیا ہے یہ غیر زمینی علاقہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں - میں نے سب سے پہلے غالب کی شاعری میں دیکھا اور اس کے اجزائے ترکیبی بھی وہیں پائے - اور پھر نئی اردو شاعری کی تحریک میں جو کچھ طے پایا اُس کے خد و خال ، ہر چند کہ غالب سے مستعار دکھائی نہیں دیتے ، تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے ضمیر متکلم کو جس قوت سے آشنا کیا تھا وہی قوت نئی اردو شاعری میں کار فرما ہے - نئی اردو شاعری اپنے مزاج ، طریق کار ، اور دریافت موہوم کی کوششوں میں غالب کے عظیم شعری فکر کو دہراتی ہے -

ادھر "مجلس یاد گار غالب" کی یہ تاکید کہ "ایک ہزار الفاظ کے اندر اندر یہ بیان کردیا جائے کہ غالب نے آپ کی ذہنی فکری اور جذباتی زندگی کو کس عنوان سے متاثر کیا ہے" ادھر اظہار خیال کرنے والوں کو غالب کی یہ تہدید کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

بڑی کٹھن منزل ہے لیکن تاثر بھی تو ایسی چیز نہیں جسے آدمی چھپا جائے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب اس کے اظہار پر مجبور ہیں اور اسی مجبوری کے ہاتھوں مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میں غالب کے اس دعوائے نبوت پر:

گر شعر سخن بہ دھر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے

غالب اگر این فن سخن دین بودے
آن دین را این کتاب آئین بودے

اسوقت ایمان لایا ہوں — ع

"کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر"

ہوا یہ کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سن بلوغ تک گھر اور گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ ذہن کے لاشعوری خانے کا جزو بن گئے۔ جیسے جیسے شعر و سخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان ان کی نبوت پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہنما اور مشکل کشا بن گئے۔ اگر تعلی سے تعبیر نہ کریں تو سمجھ لیجیے کہ اردو شاعری کی دنیا میں ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی بلکہ آغاز سفر ہی میں راہبر کو پہچان لیا تھا۔ اس راہبر نے میری جذباتی فکری اور ذہنی دنیا کو کس کس انداز سے متاثر کیا ہے، اس تفصیل کی گنجائش کہاں مجملاً اس قدر عرض کروں گا کہ زندگی اور شعر و ادب کے باب میں جتنا کچھ میں نے غالب سے سیکھا ہے اردو و فارسی کے کسی شاعر سے نہیں سیکھا۔

شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے، حمزہ کا قصہ نہیں دل گداختہ کی تفسیر ہے۔ لڑکوں کا کھیل نہیں، جزو میں کل کی نمائش ہے۔ قد و گیسو کی آرائش نہیں دار و رسن کی

آزمائش ہے ، دشنہ و خنجر و بادہ و ساغر کا تذکرہ نہیں ، مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے ۔ اسی طرح کی بہت سی باتوں کا شعور و احساس ابتداً مجھے غالب ہی سے ملا ہے ۔

فلسفہٗ جدلیات اور کرشمہٗ اضداد اور زندگی و ادب کے رشتوں کے متعلق ہیگل اور میتھو آرنلڈ سے لے کر علامہ اقبال و مجنوں گور کھپوری تک پڑھنے کو تو کیا کچھ نہ پڑھا تھا لیکن ذہن سے بڑھ کر دل میں بات اس وقت اتری جب غالب کے اس نوع کے شعر سامنے آئے ۔

کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

محاکات شعری اور تخیئل کی گلکاری و رسائی کے بارے میں مقدمہٗ شعر و شاعری اور شعرالعجم میں بہت کچھ پڑھا تھا ۔ لیکن ذوق کی تشفی اور ذہن کی سیرابی کا سامان اس وقت میسر

آیا جب غالب کے اس قسم کے اشعار نظر سے گزرے :

"نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہے
تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشان ہو گئیں

رنگِ شکستہ صبحِ بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

زندگی کی گہما گہمی اور کار جہان کی درازی کی خبر دوسرے شاعروں نے بھی دی تھی لیکن اس خیال کا سچا لطف اس شعر کے بعد نصیب ہوا :

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اب تک
رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے

معاشی عدم مساوات کی لعنتوں ، مزدور پر سرمایہ داو کی سختیوں اورکسان پر جاگیردار کی زبردستیوں کے قصے صرف یہی نہیں کہ پڑھے یا سنے تھے بلکہ اس قسم کے واقعات آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن جب تک غالب کا درج ذیل شعر نظر سے نہ گزرا تھا افلاس و ناداری پر دولت و سرمایہ کے جبرو استبداد کا پورا احساس نہ ہوا تھا ع

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

رجائیت کے انتہا پسند مبلغوں نے زندگی کو یکسر نشاط اور قنوطیت کے ازلی طرف داروں نے اسے یکسر غم ثابت کر دکھانے کی کیا کیا کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن جب غالب کے اس قسم کے اشعار سامنے آئے:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
نالے سے وا ماندگی میں ہر کوئی ناچار ہے

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

تب اندازہ ہوا کہ فطرت انسانی اور لازمۂ بشریت سے دونوں بے خبر ہیں زندگی حقیقتاً ایک سے نہیں غم اور خوشی دونوں سے عبارت ہے۔

ایجاز و اختصار اور معنی خیزی و معنی آفرینی کی تعریفیں پہلے بھی پڑھی تھیں لیکن اس قسم کے اشعار سے پہلے:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کوزے میں سمندر بند کرنا کسے کہتے ہیں اور محذوفات و مقدرات شعر کی تاثیر کس طرح بڑھا دیتے ہیں۔

حیات و کائنات اور اس کے ارتقا کے متعلق ڈارون اور دوسرے مفکرین کے توسط سے کیا کچھ نہ سن رکھا تھا لیکن

یہ راز کہ غزل میں ان خیالات کا حیات افروز اور نشاط خیز مصرف کس طرح ہونا چاہیے ذیل کے اشعار سے منکشف ہوا۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لیے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب ہیں

فلسفیانہ طرز فکر اور حکیمانہ اسلوب کے متعلق یہ تو سن رکھا تھا کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے ہمیشہ استدلال کے ساتھ کہتا ہے جو دعویٰ کرتا ہے ثبوت کے ساتھ کرتا ہے لیکن شنیدہ کو دیدہ کی حیثیت کچھ اس قسم کے اشعار کے بعد نصیب ہوئی:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

طنز و ظرافت کے سلسلے میں جعفر کی زٹلیات سودا کی ہجویات اور انشا و مصحفی کی خرافات سبھی کچھ نظر سے گزری تھیں لیکن اس طرز خاص کی حلاوت و حذاقت اور لطافت

و افادیت اس وقت سمجھ میں آئی جب مرزا نوشہ کے اس نوع کے اشعار مطالعہ میں آئے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ، طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

شنیدہ ای کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
بہ بین کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ جاتا تو میں لائق تعزیر بھی تھا

لفظ و معنی کے ربط باہمی پر بہت کچھ پڑھا تھا اور شاعری میں رعایتِ الفاظ کی حسنِ خیزی کے متعلق ”حدائق السحر“ سے لے کر ”المعجم“ تک بہت کچھ سمجھا تھا لیکن جب تک یہ اشعار:

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

نظر سے نہ گزرے تھے رعایت لفظی کو عیب کے سوا ہنر کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رجائیت اور رجائی نقطہ نظر کے متعلق فلسفہ و نفسیات کی بحثوں اور اقبال کے سلسلے کی کتب و مقالات میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن یہ نکتہ کہ شعر و ادب میں اس نقطۂ نظر کو کس سطح پر اور کس انداز سے دخیل ہونا چاہیے، غالب کے ان اشعار کے بعد سمجھ میں آیا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آو نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

غرض کہ غالب اور کلام غالب نے فکر و فن کے ان گنت نکتے سمجھائے ہیں ذہن کے نہ جانے کتنے گوشوں کو منور کیا:

"چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا"

کی معرفت نے میری فکری اور جذباتی زندگی کو کسی ایک

عنوان سے نہیں سیکڑوں عنوان سے متاثر کیا ہے ۔

لیکن یہ تاثر :

"اے کاش کبھی معرض اظہار میں آوے"

نذیر صدیقی

غالب میرے دو تین نہایت پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں - مجھے اردو کے بڑے شاعروں میں غالب کے علاوہ میر اور اقبال بھی بہت عزیز رہے ہیں - اگر کوئی شخص مجھے یہ بتانے پر مجبور کرے کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ کون پسند ہے تو غالباً میں غالب ہی کا نام لوں گا - میں ان تینوں کی تقابلی عظمت کے بارے میں کسی قطعی فیصلے تک نہیں پہنچ سکا ہوں - حسن عسکری اپنی تحریروں میں میر کو غالب پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں اور ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے مجھے اقبال غالب سے برتر معلوم ہوتے ہیں - لیکن غالب کی شاعری میں کئی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر مجھے غالب میر سے زیادہ دلکش اور اقبال سے زیادہ دیرپا شاعر محسوس ہوتے ہیں - بہر حال میں یہاں یہ فیصلہ کرنے نہیں بیٹھا کہ میر غالب اور اقبال سے سب میں بڑا شاعر کون ہے - مجھے اعتراف یہ کرنا ہے کہ اردو کے بڑے شاعروں میں سب سے زیادہ غالب کو چاہنے کے باوجود میں اس چاہت کی ذمہ داریوں کو آج تک پورا نہیں کر سکا ہوں - غالب سے

میری واقفیت ویسی نہیں ہے جیسی غالب کے ایک سنجیدہ طالب علم کی ہونی چاہیے۔ اور غالب ہی پر کیا منحصر ہے اپنے حالات (اندوہ فرصت یک طرف ذوق تماشا یک طرف) کے باعث میں کسی بھی ادیب یا شاعر سے عاشقانہ دل چسپی کے باوجود اس کا عارفانہ ادراک حاصل نہیں کر سکا ہوں۔ پندرہ بیس سال سے تنقید نگاری کی مشق کے باوجود مجھے آج تک غالب پر تنقیدی مضمون لکھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اور آج میں غالب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ مجلس یاد گار غالب کی فرمائش کے مطابق مجھے غالب پر تنقیدی مضمون نہیں لکھنا ہے بلکہ غالب پر لکھنے کے بہانے ایسے تاثرات و خیالات پیش کرنے ہیں جو غالب کی شاعری کے مطالعے سے میرے دل و دماغ میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں۔

غالب اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جو انسانی جذبات و نفسیات کی مصوری میں غیر معمولی مہارت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی جذبات و نفسیات کے لطیف ترین پہلوؤں کا حسین ترین اظہار ملتا ہے جس سے دوسروں کی طرح میں بھی لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ لیکن میری جذباتی زندگی پر ان کا جو شعر سب سے زیادہ اثرانداز ہوا ہے وہ ایک ایسا شعر ہے جسے خیال یا بیان کسی اعتبار سے بھی ان کے

نہایت اچھے شعروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود ان کے اس شعر میں ایک ایسی نفسیاتی صداقت پائی جاتی ہے جس کی طرف غالباً غالب کے سوا اردو کے کسی اور شاعر کی نظر نہیں گئی۔ شعر یہ ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر محبوب کی بے التفاتی اور بے وفائی کی عام رسمی شکایت ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس شعر میں انسانی نفسیات کا ایک نہایت لطیف نکتہ پوشیدہ ہے اور اس نکتے کی طرف شاید میری نظر بھی نہ جاتی اگر میں اپنی جذباتی زندگی میں اس تجربے سے نہ گزرا ہوتا جو اس شعر کا نفس مضمون ہے۔ میرے ذاتی تجربے نے مجھ پر اس شعر کی معنویت کو روشن کیا اور اس شعر نے میرے ذاتی تجربے کی نوعیت کو مجھ پر واضح کیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ نفسیاتی نکتہ اور ذاتی تجربہ جو اس شعر کا موضوع ہے کیا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب کسی کو اپنی محبت کا جواب محبت سے ملتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا خلوص رنگ لایا۔ میری محبت اور میری دل سوزی محبوب کے دل پر اثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس لیے وہ مجھ پر ملتفت اور مہربان ہو گیا۔ ایکن

دو دلوں کے اتصال و اتحاد میں اتفاق کا عنصر جو کردار ادا کرتا ہے اس کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی اور اگر جائے بھی تو انسانی فطرت شاید ہی اتفاق کے کردار کا اعتراف کرنے پر امادہ ہو ۔ محبت کے معاملے میں اتفاق کے کردار کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ جس طرح آپ کو کسی کی ذات میں بعض ایسی خوبیاں محسوس ہوتی ہیں جن کی بنا پر آپ اپنا دل نثار کر بیٹھتے ہیں اسی طرح جب تک دوسرے فریق کو آپ کی ذات میں ایسی خوبیاں محسوس نہ ہوں جو اس کو آپ کی طرف کھینچ سکیں اس وقت تک وہ آپ کی صرف جان نثاری اور دل فگاری سے متاثر نہیں ہوتا ۔ وہ آپ کے جذبات محبت کی قدر کر سکتا ہے ۔ لیکن وہ آپ سے محبت نہیں کر سکتا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپ کی محبت کو اپنے لیے ایک مصیبت تصور کرنے لگے ۔ جوابی محبت کے لیے قطعاً ضروری ہے کہ محبوب کو بھی آپ کی ذات میں کوئی ۔ ایسی چیز مل جائے جو اس کو آپ کی طرف کھینچ لے یا کھینچ سکے ۔ اب یہ اتفاق نہیں تو اور کیا ہے کہ جس طرح آپ کو کسی کی ذات میں کوئی خصوصیت باعثِ کشش محسوس ہوئی اسی طرح اس کو بھی آپ کی ذات میں کوئی چیز پر کشش نظر آئی ۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا یک طرفہ محبت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے ۔ اور یک طرفہ محبت میں تمام دل سوزی اور جان نثاری بے سود ثابت ہوتی

ہے ۔ آہیں اور کراہیں اگر محبوب کے دل کو متاثر کرتی بھی ہیں تو اس حد تک نہیں کہ وہ اپنے عاشق کو محض اس کے حال زار کی بنا پر چاہنے لگے ۔ عاشق کی زبوں حالی محبوب کے دل میں ترحم پیدا کر سکتی ہے لیکن محبت نہیں ۔ یہی وہ عوامل ہیں جن کی بنا پر غالب کو کہنا پڑا کہ آثر فریاد دلہائے حزین کا کس نے دیکھا ہے ۔ ان تمام باتوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ عاشق کے محبوب کی محبت عاشق کی دیوانگی اور دل سوزی سے زیادہ حسن اتفاق پر منحصر ہوتی ہے ۔ اس اعتراف کے معنی یہ ہیں کہ محبت کے معاملے میں حسن اتفاق عشق سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ عام انسانی فطرت اس ناخوش گوار حقیقت کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہو سکتی ۔ میں چونکہ طبعاً زندگی کی تلخ سے تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے پر آمادہ رہا ہوں اس لیے مجھے اپنی جذباتی زندگی میں اپنے خلوص ، اپنی دل سوزی اور جان فروشی کی بے مائگی اور بے اثری کا اعتراف کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے غالب کے مندرجہ بالا شعر کو زندگی کی ایک اہم حقیقت کے ادراک میں معاون پایا اور باوجود اس کے کہ میں اسے غالب کے بہترین شعروں میں شمار نہیں کرتا مجھے ان کا یہ شعر بے حد عزیز ہے ۔ اسے کچھ تو اس شعر کا اثر کہیے اور کچھ

ذاتی تجربے کا فیضان کہ اس موضوع پر میں نے بھی دو شعر کہے

اتفاقی ہے دو دلوں کا ملاپ
کون سنتا ہے ورنہ کس کی پکار

ملتفت خود نہ ہو اگر کوئی
آہ بے سود اور فغاں بیکار

زندگی میں کامیابی کا راز کیا ہے ؟ کامیابی کے تصور کے اعتبار سے اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں ۔ لیکن ان تمام جوابوں میں غالباً ایک بات مشترک ہوگی ۔ وہ یہ کہ آدمی اپنے حدود کو پہچانے اور ان حدود کے اندر رہ کر عمل کرے ۔ معمولی صلاحیتوں کے لوگ انتہائی محدود دائرے کے اندر ہر گرم عمل رہا کرتے ہیں ۔ ان کی زندگی کا مقصد کوئی امتیازی کامیابی حاصل کرنا نہیں بلکہ صرف جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنا یا اس قسم کی دوسری ضروریات زندگی کو پورا کرنا (مثلاً بال بچوں کی پرورش ، ان کی شادی وادی) ہوتا ہے ۔ لیکن ذہین اور حوصلہ مند لوگ اپنی صلاحیتوں سے بدرجہا زیادہ کر گزرنا چاہتے ہیں ۔ ایسوں کے عمل میں ارتکاز کی کمی انھیں لے ڈوبتی ہے ۔ زندگی میں کامیابی اور شادکامی کے لیے ضروری ہے کہ اگر آدمی غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کا مالک ہو تو ایک سے زائد میدانوں میں تگ و دو

کرے ورنہ کسی ایک مخصوص نصب العین پر اپنی محدود ذہانت اور صلاحیت کو مرکوز کردے ۔ یہ زندگی کا ایک سنہرا اصول ہے جس پر میں عمل کر سکوں یا نہیں لیکن اس کی صحت ، صداقت اور افادیت کو محسوس ضرور کرتا رہا ہوں میرے ذہن پر زندگی یا کامیابی سے متعلق یہ نکتہ غالب کے اس شعر کی بدولت روشن ہوا

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نہ تواں گشتن
جوئی بہ خیاباں رو سیلی بہ بیاباں شو

میں پیشے کے اعتبار سے معلم ہوں اور اپنی ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے شاعر اور انشائیہ نگار ہونے کے علاوہ تنقید نگار بھی ۔ تدریس و تنقید میں جو اصول میرے لیے دستورالعمل کی حیثیت رکھتے ہیں وہ میں نے غالب ہی کے اشعار سے اخذ کیے ہیں ۔ غالب کے ان اشعار سے سمجھ لیجیے کہ وہ اصول کیا ہیں

آوازۂ معنی را برساز دبستاں زن
ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست